ترکِ رذائل واکتسابِ فضائل

شائع کردہ
شعبہ تعلیم وتربیت

دارُ الاِسلام مرکز تنظیم اسلامی، ملتان روڈ چوہنگ، لاہور 53800
فون: 78-(042)35473375
ای میل: markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ	2
2	اخلاقی شخصیت کی تشکیل	6
3	نیکی اور بدی	12
4	ترکِ رذائل	18
5	حب دنیا	19
6	رزق حرام	29
7	اسراف	34
8	رسوم ورواج کی بے جا پابندی	42
9	کام چوری	47
10	بطر اور دکھاوا	52
11	زبان کی حفاظت	57
12	سستی اور کسل مندی	61
13	اعراض عن اللغو	65
14	اکتسابِ فضائل	70
15	صلہ رحمی	71
16	عفو ودرگزر	77
17	میانہ روی	84
18	حِلم وبردباری	94
19	تواضع	99
20	حیاء کا مفہوم اور اس کے تقاضے	107
21	خوف ورَجا	112
22	ادب واحترام	120
23	اہل خانہ کی تربیت	131

پیش لفظ

"خلق" اس پختہ نفسیاتی کیفیت کو کہتے ہیں جس سے وہ اچھے یا برے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو انسان اپنے ارادے واختیار سے کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے رب کو پہچان لے، اس کی معرفت حاصل کرلے اور عالم ارواح میں اپنے رب سے کیا ہوا عہد اس کی فطرت بن جائے تو اس سے لازماً اچھے اعمال بلا تکلف صادر ہوں گے اور اسی کا نام حُسنِ خلق ہے۔ بصورت دیگر لازماً برے اخلاق اس سے صادر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ وہ حیوانی اور ملکوتی صفات کا مجموعہ ہے۔ اس کی بہیمیت اسے نفس کی خواہشات کی طرف کھینچتی ہے جبکہ اس کی روح اسے اچھی صفات اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان کو خیر اور شر کا شعور بخشا گیا ہے۔ پھر انسان کے نفس میں ایک ایسی قوت اور استعداد بھی رکھ دی گئی ہے جس کے بارے میں سورۃ الانفال آیت نمبر 29 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کے تقویٰ پر برقرار رہو گے تو وہ تمہارے لیے فرقان پیدا کردے گا۔'' اسی حق وباطل میں تمیز رکھنے کی صلاحیت کی وجہ سے انسان فطری طور پر خیر اور اصلاح کے کاموں کی طرف بڑھنے کا رجحان رکھتا ہے اور شر اور برائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ایک سچے مومن سے یہی مطلوب ہے کہ اس کا اخلاق بہترین ہوجائے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے (خَيْرُكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا) (تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں) وہ ہر قسم کے برے کام اور برے اخلاق چھوڑ دے اور ہر طرح کا خیر اور بہترین اخلاق اپنانے کی کوشش کرے۔ سورۃ القلم کی آیت نمبر 4 میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے کہا گیا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! بلاشبہ آپ خُلقِ عظیم کے رتبے پر فائز ہیں"

اس طرح سورۃ الشمس آیت نمبر 9-10 میں فرمایا گیا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا

ترجمہ: "وہ مراد پا گیا جس نے اپنے (نفس) کا تزکیہ کرلیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اپنے (نفس) کو مٹی میں ملا دیا"

اسی اچھے اخلاق کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

عن أبي الدرداء رضي الله عنه: أن النبي ﷺ، قال: { مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ اللهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ
(رواه الترمذي)

ترجمہ: "حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: قیامت کے دن مومن کے میزان میں خوش خلقی سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی اور بے شک اللہ تعالیٰ بے حیاء اور فحش گو سے سخت نفرت کرتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں جو ابودرداء رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے۔ اس میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں۔

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلَا اللَّعَّانِ، وَلَا الْفَاحِشِ، وَلَا الْبَذِيءِ

ترجمہ: "مومن طعنہ مارنے والا، لعنت کرنے والا، بے حیاء اور فحش گو نہیں ہوتا۔"

حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی چیز لوگوں کو کثرت سے جنت میں داخل کرے گی؟
فرمایا: اللہ کا تقویٰ اور حسن اخلاق۔ پوچھا گیا جہنم میں اکثریت کو لے جانے والی کون سی چیز ہے؟
فرمایا: منہ اور شرمگاہ (رواہ ترمذی)

ظاہر ہے اللہ کے تقویٰ سے مراد برے کاموں اور برے اخلاق سے بچنا ہے اور حسن اخلاق سے مراد تمام اچھی خصلتوں کو حرز جان بنانا ہے۔

ترمذی کی ایک اور روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اَكْمَلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا

ترجمہ: "سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں بہترین ہے۔"

بہترین اخلاق سے مراد ہے کہ ہم ہر وہ کام اور رذیلہ (برائی) چھوڑ دیں جس سے شریعت

میں منع کیا گیا ہو اور جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور ہر وہ اچھائی اور فضل حاصل کرنے کی کوشش کریں جیسے شریعت میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہو۔

پھر ہمیں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ترکِ رذائل (ناپسندیدہ برائیوں اور عادات کو چھوڑ دینا) اکتسابِ فضائل (پسندیدہ اچھائیاں اور اچھی عادات کو اپنانا) پر فوقیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں برے اخلاق سے چھٹکارا حاصل کرنے کی طرف فوری توجہ کرنی چاہئے۔ اور پھر اچھی عادات کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قرآن مجید کی اہم اصطلاحات میں سے دو اہم اصطلاحات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہیں۔ ویسے تو "امر بامعروف اور نہی عن المنکر" لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور قرآن مجید میں 9 مقامات پر یہ اصطلاح اسی طرح آئی ہے مگر ان میں بھی اہم ترین نہی عن المنکر ہے۔

سورۃ البقرہ آیت نمبر 256 میں ارشاد گرامی ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا

ترجمہ: "تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔"

یعنی انسان برائیوں سے اجتناب تو فوراً شروع کر دے اور پھر نیک کام بھی کرنے شروع کر دے۔ پہلے اللہ کی سرکشی کا راستہ چھوڑے۔

اسی طرح سورۃ الزمر آیت نمبر 17-18 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ

ترجمہ: "اور وہ لوگ جنہوں نے طاغوت سے کنارہ کشی کر لی (اس طرح) کہ اُس کی بندگی نہ کی اور انہوں نے رجوع کر لیا اللہ کی طرف، اُن کے لیے بشارت ہے، تو (اے نبی ﷺ!) میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں، پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔"

اسی طرح احادیث میں بھی ہمیں نہی عن المنکر پر زیادہ زور نظر آتا ہے۔ مثلاً:

بخاری و مسلم کی درج ذیل روایت میں نبی اکرم ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر اس شخص کے ایمان ہی کی نفی کی ہے۔ جس سے اس کے پڑوسی مامون اور بے خوف نہ ہوں۔

وَاللّٰهِ! لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ! لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ! لَا يُؤْمِنُ، قِيلَ: وَمَنْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اَلَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں۔ پوچھا گیا" یا رسول اللہ! کون شخص؟ فرمایا: وہ آدمی جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ زیر نظر کتابچہ میں بھی ہم نے پہلے ترکِ رذائل کو بیان کیا ہے اور پھر اکتسابِ فضائل کا تذکرہ کیا ہے۔

زیر نظر کتابچے میں چند رذائل کا تذکرہ ہے جن سے ہمیں چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے اور چند ہی فضائل کا بھی تذکرہ ہے جن کے حصول کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ ویسے تو رذائل اور فضائل کی فہرست بہت طویل ہوگی، مگر کوشش کی گئی ہے کہ چند ایسے بنیادی رذائل کا تذکرہ کر دیا جائے کہ اگر ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے تو باقی رذائل سے بھی بچنا آسان ہو جائے۔ اسی طرح کچھ ایسے ضروری فضائل کو بیان کر دیا جائے کہ جن پر عمل کرنے کی عادت ڈالنے سے دوسرے فضائل بھی بآسانی عمل میں آ جائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حضور ﷺ کے نقش قدم پر چل کر اعلیٰ اخلاق سے متصف فرمائے اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے۔

آمین یارب العالمین

اخلاقی شخصیت کی تشکیل

دین کا اصل مقصود اللہ کی رضا کا حصول ہے۔جیسا کہ سورۃ الفتح آیت 29 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

ترجمہ: "محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔اور جو ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں۔تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے، وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں۔"

اس مقصد کے حصول کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت ہے۔ یا بالفاظ دیگر ایمان اور عمل صالح ہے۔جیسا کہ سورۃ الذاریات آیت نمبر 56 میں وارد ہوا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

ترجمہ: "اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

اور سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 75 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى

ترجمہ: "اور جو کوئی آئے گا اس کے پاس مؤمن کی حیثیت سے (اور اس حالت میں کہ) اس نے نیک اعمال بھی کیے ہوں، تو یہ لوگ ہیں جن کے لیے اعلیٰ درجات ہوں گے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کا حصول، جنت میں اعلیٰ درجات اور تقرب الی اللہ کیسے حاصل کیا جائے؟

یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔پہلی رکاوٹ تو خود انسان کا اپنا نفس ہے۔انسانی نفس کسی قانون یا ضابطہ کی پابندی نہیں کرنا چاہتا۔وہ تو یہ چاہتا ہے کہ میری خواہشات بھرپور طریقے سے پوری کی جائیں خواہ جائز طریقہ سے پوری ہوں یا ناجائز طریقہ سے۔پھر اس پر مستزاد شیطان اور اس کے حواریوں کا

خواہشات اور شہوات کو ابھارنا، انہیں پورا کرنے کی ترغیب دینا جبکہ دورِ حاضر میں تو شر کی قوتیں منظم ہو کر ہر سمت سے انسان پر اس طرح حملہ آور ہو رہی ہیں کہ انسان کا بچنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور صراط مستقیم پر چلنے کے لیے بہت زیادہ تگ و دو درکار ہے۔اندریں حالات ہمیں اپنے آپ کو، اپنے اہل وعیال کو اور پوری امت مسلمہ کو شیطان اور اس کے حواریوں سے بچانے کی فکر کرنی ہے۔

شیطان اور شیطانی ترغیبات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو قابو میں رکھے اور اپنی روح کی غذا کا بھی سامان کرے تا کہ اس کی روح اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ انسانی نفس کو اس کی ناجائز خواہشات کی تکمیل سے روک سکے۔اسی طرح ایک حسین اخلاقی شخصیت کی تشکیل ہو سکتی ہے۔احادیث میں اعلیٰ اخلاق کی بہت ترغیب آئی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ

(رواہ ابوداؤد)

"بے شک مومن اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہیں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں"

مطلب یہ کہ اللہ کے جس بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے سچا مومن ہو اور ساتھ ہی اس کو حسن اخلاق کی دولت بھی نصیب ہو تو اگرچہ وہ رات کو زیادہ نفلیں نہ پڑھتا ہو اور کثرت سے نفلی روزے نہ رکھتا ہو، لیکن پھر بھی اپنے حسنِ اخلاق سے ان شب بیدار عبادت گزاروں کا درجہ پالے گا جو قائم اللیل اور صائم النہار ہوں یعنی جو راتیں نوافل میں گزارتے ہوں اور دن کو عموماً روزہ رکھتے ہوں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ وَاَقْرَبِكُمْ مِنِّيْ مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا

"تم میں سے مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن ان ہی کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہو گی جن کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہیں۔"

گویا رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت اور قیامت کے دن آپ کا قرب نصیب ہونے میں حسن اخلاق کی دولت کو خاص دخل حاصل ہے۔

ابودرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ شَیْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ (ابوداؤد و ترمذی)

"قیامت کے دن مومن کی میزانِ عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہ ہوگی"

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: "ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اخلاق میں ایسی نسبت ہے کہ جس کا ایمان کامل ہوگا، اس کے اخلاق لازماً اچھے ہوں گے۔ اسی طرح جس کے اخلاق بہت اچھے ہوں گے۔ اس کا ایمان بھی کامل ہوگا۔ البتہ واضح رہے کہ ایمان کے بغیر اخلاق ہی نہیں بلکہ کسی عمل کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہر عمل اور ہر نیکی کے لیے ایمان بمنزلہ روح کے ہے۔ اس لیے اگر کسی شخصیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے بغیر اخلاق نظر آئے تو وہ حقیقی اخلاق نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ضرور ہے۔ اس لیے اللہ کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بتایا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی بُرے اخلاق سے اپنی حفاظت کرے اور اخلاقِ حسنہ اختیار کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے جن مقاصد کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کا تزکیہ کرنا ہے۔ (وَيُزَكِّيهِمْ)۔ اس تزکیہ میں اخلاق کی اصلاح اور درستگی کی خاص اہمیت ہے۔ آپ ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

(میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچادوں) (رواہ احمد عن ابی ہریرۃ)

یعنی اصلاحِ اخلاق کا کام میری بعثت کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیوں کہ انسان کی زندگی اور اس کے نتائج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوش گواری کے ساتھ گزرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث سامان ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آدمی کے اخلاق بُرے ہوں تو وہ

خود بھی زندگی کے لطف و مسرت سے محروم رہے گا اور جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا، ان کی زندگیاں بھی بے مزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بداخلاقی کے وہ نقد دنیوی نتائج ہیں جن کا ہم سب روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد والی ابدی زندگی میں ان دونوں کے نتائج ان سے بدرجہا زیادہ اہم نکلنے والے ہیں۔ آخرت میں خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے جب کہ بداخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور دوزخ کی آگ ہے۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهَا اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَنَعِيمَهَا وَنَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَجَحِيمِهَا

خود کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے ہمیں قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارے اندر کون کون سی بری عادتیں ہیں۔ ہمارے کون کون سے برے اخلاق ہیں۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مجھے کون کون سی اچھی عادتیں اپنانے کی ضرورت ہے؟ تبھی ہم اللہ کی نظر میں ایک اچھے اور مطلوب مومن بن سکیں گے۔

جب ہم دیانتداری سے خود اپنا محاسبہ شروع کردیں گے تو معلوم ہوگا کہ میرے اندر تو یہ ساری برائیاں موجود ہیں۔ ایک طرف تو یہ احساس بہت مفید ہے مگر بعض اوقات دوسری طرف یہی چیزیں انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتی ہیں کہ میں اتنی ساری برائیوں سے کیسے نجات پاسکتا ہوں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم مایوس نہ ہوں۔ اس کے لیے پہلا کام تو یہ کریں کہ اپنی اصلاح کا عزمِ مصمم کریں۔ یہ عزم کرنا بذاتِ خود ایک نیکی ہے۔ دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ آج اور ابھی اسی وقت سے اس ارادہ پر کام بھی شروع کردیں۔ آج کا کام کل پر نہ ٹالیں۔ ان برائیوں کو دور ہوتے ہوتے اور اندر سے نکلنے میں وقت لگے گا۔ بس ہمارا کام یہ ہے کہ ہم برائیوں کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رکھیں۔ شعوری طور پر یہ بھی جان لیں کہ نہ تو ہم فرشتہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہم سے فرشتہ بننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہم سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ ہم اپنا تزکیہ کا عمل مسلسل جاری رکھیں۔ برائیوں پر نظر رکھیں۔ انہیں پہچانیں اور انہیں دور کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ جس طرح اپنی برائیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اپنے اندر اچھے اخلاق کو بھی پروان چڑھانے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ تزکیہ کا عمل شروع کرنے کے لیے توانائی درکار ہے۔ یہ توانائی ایمان میں

اضافہ سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی آیات پڑھ کر ایمان میں گرمی اور حلاوت پیدا ہوتی ہے۔

ترجمہ کے ساتھ سمجھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنے سے ہمارے اندر ایسی پوشیدہ توانائی پیدا ہوتی ہے جو ہمیں ہمارے دین پر چلنے، برائیوں کو چھوڑنے اور اچھے اخلاق اپنانے کے جذبہ کو پروان چڑھاتی ہے۔ اللہ کی آیات پڑھنے سے دل نرم ہوتا ہے اور دل کے اندر گداز پیدا ہوتا ہے اور انسانی نفس نیک کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

انسانیت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے وعظ و تذکیر، معاشرتی دباؤ اور اصلاحی تحریکات ایک حد تک تو مفید ثابت ہو سکتی ہیں لیکن ان کے ذریعہ جرائم سے مکمل تطہیر عملاً ناممکن ہے۔ جرائم سے مکمل تطہیر صرف اسی معاشرہ میں ممکن ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظامِ عدل وقسط نافذ ہو۔ ہر شخص کے حقوق کا تحفظ ہو رہا ہو۔ حکومت کفالتِ عامہ کی ذمہ دار ہو ہر انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں۔ حدود اور تعزیرات کا نظام قائم ہو۔ لہٰذا ایک صالح معاشرہ وجود میں لانے کے لیے ہمیں غلبۂ دین کی جدوجہد بھی کرنی ہوگی۔

اعلیٰ اخلاق اقدار اور پاکیزہ خصلتیں اس معاشرہ میں پروان چڑھتی ہیں جہاں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور ایسے لوگوں کو عزت و احترام عطا کیا جاتا ہو، لیکن جب سے ہم ہر پابندی سے آزاد سوشل میڈیا کے دور میں داخل ہوئے ہیں، ہماری اقدار و معیارات بدل گئے ہیں۔ دوسری طرف کاروباری، تشہیری اور پروپیگنڈا کی صنعت نے تمام ترجیحات بدل کر رکھ دی ہیں۔ ہر چیز کو لذتِ نظر، لذتِ سماع، ذہنی آوارگی اور شہوت رانی کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں چند پاکیزہ فطرت انسانوں کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کریں جہاں نیکی پر چلنا آسان ہو جائے۔ ایسا معاشرہ نظامِ عدل وقسط کے نافذ ہونے ہی سے ممکن ہوگا۔ جہاں ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں، جہاں کسی کا حق نہ مارا جا رہا ہو اور جہاں عدل وانصاف ہو رہا ہو۔ تب اللہ تعالیٰ بھی آسمان اور زمین سے ہمارے لیے خوش حالی کے تمام دروازے کھول دے گا۔ خوشحالی اور امن کا ایسا دور دورہ ہوگا جس سے انسانیت کو اب تک واسطہ ہی نہیں پڑا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے قلوب کی اصلاح اور تزکیہ فرمادے۔ ہمیں دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم دوسروں کے لئے بقول حضرت عیسیٰؑ پہاڑی کے ایسے

چراغ بن جائیں جن سے لوگ راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی دین پر چلنا آسان ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک خوبصورت اخلاقی شخصیت بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم اللہ کی نظر میں ایک ایسا مومن بن جائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرنے لگے۔

حسن اخلاق کے سلسلہ میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل مسنون دعائیں بھی پڑھتے رہنی چاہئیں۔

اللّٰهُمَّ أَحْسَنْتَ خَلْقِي فَأَحْسِنْ خُلُقِي (رواہ احمد عن عائشہ ؓ)

"اے میرے اللہ! تونے اپنے کرم سے جس طرح میرے جسم کی ظاہری بناوٹ اچھی بنائی ہے، اسی طرح میرے اخلاق بھی اچھے کردے۔"

نبی اکرم ﷺ تہجد کی نماز میں اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللّٰهُمَّ اهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ، فَإِنَّهُ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ، وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ

"اے میرے اللہ! تو میری رہنمائی کر بہتر سے بہتر اخلاق کی طرف، تیرے سوا کوئی بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتا، اور برے اخلاق کو میری طرف سے ہٹا دے، ان کو تیرے سوا کوئی ہٹا بھی نہیں سکتا۔" (صحیح مسلم عن حضرت علی ؓ)

نیکی اور بدی

آپ سوچ رہے ہوں گے نیکی اور بدی کے بارے میں کیسے معلوم نہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے سے کیا فائدہ نیکی اور بدی کے بارے میں تو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہیں یہ ہماری غلط فہمی ہے نیکی اور بدی کے بارے میں ہم بہت سے مغالطوں کا شکار ہیں۔ اطمینان رکھیے ہم کوئی بہت مشکل باتیں کرنے نہیں جارہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ " حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دین بہت آسان ہے۔ نیکی اور بدی کا قانون بھی بڑا آسان اور سراسر رحمت کا قانون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یروی عن ربہ عز وجل، قال: إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الحَسَناتِ والسَّيِّئاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذلكَ، فَمَن هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْها، كَتَبَها اللّٰهُ له عِندَهُ حَسَنَةً كامِلَةً، فإنْ هو هَمَّ بها فَعَمِلَها، كَتَبَها اللّٰهُ له عِندَهُ عَشْرَ حَسَناتٍ إلى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ، إلى أضْعافٍ كَثِيرَةٍ، ومَن هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْها، كَتَبَها اللّٰهُ له عِندَهُ حَسَنَةً كامِلَةً، فإنْ هو هَمَّ بها فَعَمِلَها، كَتَبَها اللّٰهُ له سَيِّئَةً واحِدَةً. (مسلم، بخاری)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں اور پھر اس کو واضح بھی کر دیا ہے۔ کوئی شخص نیکی کا ارادہ کرے اور ابھی اس نے اس پر عمل نہ کیا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس مکمل نیکی درج فرما لیتا ہے اور اگر نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر گزرے تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کو اپنے پاس دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ لکھ لیتا ہے۔ اور اگر انسان برائی کا صرف ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو بھی اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں مکمل نیکی لکھ لیتا ہے اور برائی کا ارادہ کر کے عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس اسے صرف ایک گناہ ہی لکھتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ دین میں اصل چیز کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہے۔ انسان کو کچھ صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ پھر اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور اسی میں اس کا

امتحان ہے۔

انسان کا دل بیدار اور زندہ ہو تو وہ اچھے کام کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب دل مردہ ہو جائے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ اصل زندگی قلب کی زندگی ہے۔ اصل موت قلب کی موت ہے۔ اصل بینائی قلب کی بینائی ہے۔ اصل اندھا پن قلب کا اندھا پن ہے۔ قیامت کے روز وہی نجات پائے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا۔ اصل چیز انسان کا ارادہ اور اختیار ہے۔ ہمت کرنے سے زندگی سنور سکتی ہے۔

اور یہ دل کا مردہ ہونا گناہ پر گناہ کرنے سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ گناہ کرنے سے دل پر سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ اگر توبہ کر لے تو دھبہ صاف ہو جاتا ہے اور بغیر توبہ کیے دوسرا گناہ کرے تو دوسرا دھبہ، تیسرے گناہ پر تیسرا دھبہ اور بالآخر دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس میں نیکی و بدی کی تمیز والی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ گناہ کرنے پر دل کچوکے نہیں لگاتا۔

هَمَّ کے معنی ہیں: کسی کام کا پکا ارادہ یا عزمِ مصمم کر لینا اور پھر اس کو کرنے کی فکر میں لگے رہنا۔ بعض دوسری روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کو نیکی کے طور پر لکھ لیتا ہوں۔ کر لے تو دس گنا یا اس سے زیادہ دیتا ہوں۔ جب وہ کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک وہ کر نہ لے تو میں اس کے ارادے کو معاف کرتا رہتا ہوں۔ جب وہ برائی کر لیتا ہے تو اس کو برابر لکھتا ہوں۔ فرشتے کسی بندے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے اللہ! یہ تو برائی کا ارادہ کیے ہوئے ہے، برائی کرنا چاہ رہا ہے۔ اس پر حدیث کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پر نگاہ رکھو اور اگر یہ کر لے تو اس کے بعد اس کو لکھ لو اور اگر یہ میری جزا کی امید میں اور میرے خوف سے اس برائی کو چھوڑ دے تو پھر اسے نیکی کے طور پر لکھ لو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی برائی کو چھوڑ دینا بذاتِ خود ایک نیکی ہے۔

اجر حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ نیکی مقبول بھی ہو۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا ہوگا کہ نیکی کی مقبولیت کی کیا شرائط ہیں؟ نیکی کی قبولیت کی شرطِ اوّل ایمان ہے۔ کافر اور مشرک بھی بعض اوقات نیکی کا کام کرتے ہیں مگر ان کی وہ نیکی قبول نہیں ہوتی۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر 177 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

ترجمہ: "نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ نیکی تو اُس کی ہے، جو ایمان لائے اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر۔ اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود، قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کرلیں۔ اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔ اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔"

درحقیقت ایمان سے نیت کا تعین ہوتا ہے کہ انسان نیکی کس لیے کر رہا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مطلب ہے کہ وہ نیکی صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ پر ایمان حقیقی نہیں ہے تو پھر یا تو ریاکاری ہوگی یا پھر کچھ اور فوائد اٹھانا پیشِ نظر ہوں گے۔ مثلاً کسی نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی فاؤنڈیشن قائم کر دی اور کسی وزیر سے اس کا افتتاح بھی کرالیا یا آفت زدہ لوگوں کے لیے رقم کا چیک وزیر اعظم کے حوالے کرتے ہوئے اخبار میں تصویر بھی چھپ گئی۔ لیکن اس شخص کے پیشِ نظر کچھ دوسرے فوائد بھی اٹھانا تھا تو اب اس کی یہ نیکی کسی کام کی نہیں۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ نیکی کی قبولیت کے لیے آخرت کا یقین بھی ضروری ہے یعنی اس نیکی کا بدلہ اس دنیا میں مطلوب نہ ہو بلکہ پورا کا پورا اجر آخرت میں مطلوب ہو۔ کیونکہ دنیا میں بدلے کے لیے کوئی بھی کام کرنا تو کاروبار یا تجارت کے زمرے میں آتا ہے۔

تیسری بات جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ کہ نیکی کی قبولیت کے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نیک کام کا حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ سے ثبوت ملتا ہو۔

نیکی کا اجر حساب کتاب کی قید سے آزاد

حدیث مبارکہ میں هَمَّ کا لفظ آیا ہے۔ اسی سے لفظ ’اہتمام‘ بھی بنتا ہے اور اسی سے ’ہمت‘ کا لفظ بھی بنتا ہے۔ یعنی جس شخص نے کسی نیک کام کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی اور اس کا اہتمام بھی کرنے کی کوشش کی مگر بعض خارجی موانع کے باعث اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا یا اندرونی سستی یا کیفیات کی وجہ سے ارادہ کچھ کمزور پڑ گیا تب بھی اس ارادے کو اللہ تعالیٰ ایک مکمل نیکی اپنے پاس لکھ لے گا۔ اس نے ارادہ کیا اور اس پر عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر 700 گنا تک دے گا۔ بلکہ بعض اوقات یہ اتنی بار بڑھے گا کہ حساب کتاب کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿البقرۃ: 261﴾

ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ بڑھا چڑھا کر دے گا جس کے لیے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

نیکی کی حفاظت کرنا:

صرف نیک کام کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات قرآن مجید نے بہت اچھی طرح واضح کر دی ہے۔ کہ کسی کا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہو سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ اس کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر دے۔ خود ہی کنواں کھودے اور اس میں گر جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ: 262)

ترجمہ: "جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ کسی رنج و غم سے دوچار ہوں گے۔"

یعنی نیکی تو کی مگر جس کے ساتھ نیکی کی، اس پر اپنا احسان بھی جتلا دیا، اس کو طعنہ بھی دے دیا یا نیکی میں اخلاص نہ رہا اور اس میں ریاکاری شامل ہو گئی تو گویا اس نے نیکی کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: ہم میں سے مفلس وہ ہے جس کے پاس کوئی روپیہ پیسہ اور ساز و سامان نہ ہو۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسے

اعمال لے کر آئے گا۔ تاہم اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت دھری ہوگی، کسی کا مال (ناحق) کھایا ہوگا اور کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں گی۔ پھر اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اس پر واجب الاداء حقوق ابھی باقی رہے تو ان لوگوں کے گناہ لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (رواہ مسلم)

گویا نیک کام کرنے کے ساتھ ہمیں اپنی نیکیوں کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ وہ حفاظت اسی طرح ہوسکتی ہے کہ ہم کسی کا دل نہ دکھائیں، کسی کا ناحق مال نہ کھائیں، اپنی زبان کی حفاظت کریں اور لوگوں کے واجب الادا حقوق بھی ادا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

برائی کا معاملہ

اللہ تعالیٰ کے قوانین بھی بڑے عجیب ہیں۔ یہ کسی منطق کے تابع نہیں بلکہ سراسر فضل وکرم اور رحمت پر مبنی ہیں۔ برائی کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنے ہاں ایک نیکی لکھ لے گا اور اس پر عمل بھی کرلیا تو صرف ایک ہی گناہ لکھا جائے گا۔ اب اس برائی سے باز رہنے کی بھی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے چوری کے ارادے سے جارہا تھا مگر وہاں پر پولیس کا پہرہ تھا۔ اب منطقی تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے بدلے اسے کچھ نہیں ملنا چاہیے، اس لیے کہ اگر پولیس کا پہرا نہ ہوتا تو وہ چوری کر گزرتا، لیکن اس کے باوجود چوری نہ کرسکنے کی وجہ سے بھی اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھی گئی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے برائی کا ارادہ کیا مگر اس پر اللہ کا خوف غالب آگیا اور وہ باز آگیا۔ اس صورت میں یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی کا درجہ دے دے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو اپنے دامن رحمت میں لے لے۔

یاد رکھیے کہ سب سے بڑی اور سب سے پہلی نیکی اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کرنا ہے اور پھر اس میں بالفعل جدوجہد کرنا، تن من دھن لگانا یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اگر تم میرے وفادار ہو تو طاغوت کے کیسے وفادار ہوگئے؟ یہ دو باتیں تو اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

سورۃ البقرہ کی آیت 256 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ

ترجمہ: "تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔"

گویا پہلے طاغوت کا کفر اور انکار ہے اور پھر اللہ پر ایمان کا مرحلہ ہے۔

یعنی اللہ کے دین کے خلاف ہونے والی بغاوت کو روکنے کا ارادہ کرنا کم سے کم نیکی ہے اور بلند ترین نیکی یہ ہوگی کہ اپنا سب کچھ تن، من، دھن اس راہ میں قربان کردیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکیوں کا ارادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور خاص طور پر طاغوت سے بغاوت اور اللہ کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کا ہم نہ صرف ارادہ کریں بلکہ اس پر عملاً کاربند بھی ہوجائیں۔

ترکِ رذائل

حُبِّ دنیا

یہ دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بہت خوبصورت بنایا ہے۔ گونا گوں مختلف طریقوں سے اس دنیا کو سجایا۔ خوب صورت آبشاریں ہیں۔ مختلف رنگ اور مختلف خوشبو کے پھول، کھٹے، میٹھے، کڑوے کسیلے ہر قسم کے پھل، طرح طرح کے میوہ جات، جو انسان کے من کو بھاتے ہیں، اسے تقویت دیتے ہیں اور صحت مندانہ زندگی گزارنے میں مدد دیتے ہیں۔ بیمار ہو جائے تو علاج کے لیے ہر قسم کی جڑی بوٹیاں موجود ہیں۔ غرض انسان کی ہر قسم کی خواہشات جو بھی اس کے نفس میں پیدا ہوتی ہیں اور اسے مرغوب ہیں، ان کی بھرپور تسکین کا سامان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسے فراہم کر دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اگر سونگھنے کا ذوق عطا فرمایا تھا تو اس کے اس ذوق کی تسکین کے لیے طرح طرح کے خوشبودار پودے اور پھول پیدا کر دیے۔ زبان کا ذائقہ عطا کیا ہے تو دنیا کے دسترخوان پر ہر طرح کی پیداوار، سبزیاں، پھل، اناج اور میوے پیدا کر دیے۔ زمین کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے تو اس کی تہہ میں میٹھے، صاف شفاف پانی کے سوتے بہہ رہے ہیں۔ زمین کی گہرائی میں سونا چاندی، کوئلہ، تیل گیس کے بے شمار ذخائر موجود ہیں۔ دورِ حاضر میں توانائی کے لیے لیتھیم، یورینیم اور ریڈیم جیسی انتہائی قیمتی دھاتیں میسر ہیں۔ سمندروں کی طرف نظر کریں تو سطح پر بہت بڑے بڑے بحری بیڑے تیر رہے ہیں۔ جن پر ہوائی جہاز اترتے اور چڑھتے ہیں۔ تہہ میں چھوٹی اور بڑی دیوہیکل مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ سمندر کی تہہ میں مرجان اور موتی نشوونما پا رہے ہیں۔ حیوانات کو دیکھیں، کس کس طرح غذا کے لیے ان کا دودھ اور گوشت، سواری کے لیے ان کی پیٹھ، حفاظت کے لیے ان کی پاسبانی، پہننے اور آرائش کے لیے ان کی کھالیں اور اون ہمارے لیے مہیا کر دی گئی ہیں۔

ان تمام نعمتوں (زیب وزینت، آرام وآسائش) کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ بندہ دل وجان سے اللہ کا شکر ادا کرے، اس کا سر عجز وانکساری سے جھک جائے، خود بھی ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھائے اور دوسرے مسکینوں اور ناداروں کو بھی ان سے استفادہ کا موقع دے۔ ان کو بھی کھلائے پلائے۔ ان کی بھی ضرریات پوری کرے۔

مزید برآں اس دنیا کو خوبصورت بنانے کا مقصد یہ تھا تاکہ اس کے ذریعہ انسان کو آزمایا جائے۔

آیا وہ اس دنیا میں آ کر اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرتا ہے یا اس دنیا کی خوبصورتی اور آرام و آسائش میں گم ہو کر اللہ کو بھول جاتا ہے اور اسی دنیا کی زندگی کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ سورۃ الکہف کی آیت نمبر 7 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

ترجمہ: "یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار تاکہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں۔"

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو خوبصورت بنا کر اور انسان کو ہر طرح کی ضروریات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے سماعت، بصارت اور عقل جیسی صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جیسا کہ سورۃ الدھر آیت 2 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا

ترجمہ: "ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے کہ اس کو آزمائیں پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا دیکھنے والا۔"

یعنی یہ صلاحیتیں اسے اس لیے عطا فرمائیں تاکہ اس کی آزمائش ہو سکے، وہ اس دنیا کے دھوکے میں نہ آئے۔ اس سے صرف ضرورت کی حد تک استفادہ کرے اور دنیا میں آنے کا اصل مقصد یعنی اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزرے جیسا کہ سورۃ الذٰریات آیت نمبر 56 میں فرمانِ الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

ترجمہ: "اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

لیکن شیطان انسان کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے اور انسان اس دنیا و مافیہا سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہاں کے آرام و آسائش اور نعمتوں کو اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے دماغ میں خناس اور دل میں تکبر آ جاتا ہے اور ان تمام نعمتوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ جبکہ قرآن مجید تو ہمیں یہ تعلیم دے رہا ہے کہ یہ سب چیزیں متاع ہیں۔ یعنی برتنے کا سامان ہیں۔ اور برتنے کے سامان سے کوئی محبت نہیں کرتا۔

عربی زبان میں دنیا کے ایک معانی تو ہیں: خسیس ہونا، کمینہ و ذلیل ہونا، بہت گھٹیا ہونا۔ یعنی دنیا و مافیہا آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہیں اور ادنیٰ درجے کی ہیں۔ اسی طرح آخرت کے

عذاب کے مقابلے میں دنیا کے مصائب و مشکلات بہت ہی کم ہیں۔ لفظ دنیا کے دوسرے معانی ہیں۔ کسی چیز کے قریب ہونا کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں قریب ترین ہے۔ جلد مٹ جانے والی ہے۔ دنیا نقد ہے جبکہ آخرت تو ادھار کا سودا ہے۔

الطاف حسین حالی کہتے ہیں ؎

دنیائے دَنی کو نقش فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اِک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

دنیا کی زیب و زینت کی کشش انسان کی کمزوری ہے۔ چنانچہ سورۃ آلِ عمران آیت نمبر 14 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ

ترجمہ: "مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے اور نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی اور کھیتی۔ یہ سب دُنیوی زندگی کا ساز و سامان ہے۔ لیکن اللہ ہی کے پاس ہے اچھی لوٹنے کی جگہ۔"

مطلب یہ کہ لوگوں کے لیے دل پسند چیزوں یعنی عورتوں (موجودہ دور میں فیشن اور فحاشی کو بھی شامل کر لیں۔) بیٹوں، سونے، چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانوں، نشان زدہ گھوڑوں (دورِ حاضر میں ریس کے گھوڑے یا برانڈڈ ملبوسات جیولری اور ہیرے جواہرات) چوپایوں (اعلیٰ نسل کے کتے۔ پولٹری/ اور ڈیری فارم وغیرہ) اور کھیتی (بڑے بڑے ایگری کلچرل فارمز) کی محبت دل کش بنا دی گئی ہے۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔ اور اللہ ہی کے پاس بہترین ٹھکانا ہے۔ (آلِ عمران: 14)

انسان کی یہ بشری کمزوری ہے کہ وہ دنیا کی ناپائیدار چیزوں کو ابدی اور دائمی سمجھ لیتا ہے اور آخرت کی دائمی نعمتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "آپ انہیں دو مردوں کا قصہ سنائیں جن میں

سے ایک شخص کو ہم نے انگوروں کے دو باغ عطا فرمائے تھے۔ جن کے چاروں طرف ہم نے کھجوروں کے درختوں کی باڑ لگادی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان ہم نے کھیت پیدا کیے تھے۔ دونوں باغ خوب پھل لائے اور پیداوار میں کوئی کمی نہیں کی۔ اور ہم نے ان کے درمیان دریا رواں کر دیے تھے۔ جس شخص کے پاس باغ تھے۔ اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا" میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور میری افرادی قوت بھی زیادہ ہے۔" وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہوا باغ میں داخل ہوا اور کہنے لگا:۔۔ مجھے گمان نہیں کہ یہ باغ کبھی برباد ہوگا اور نہ مجھے اس پر یقین ہے کہ کبھی قیامت قائم ہوگی۔ اور اگر (بالفرض) میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا۔ تو میں ضرور ان باغوں سے بہتر پلٹنے کی جگہ پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا: "کیا تم اس ذات کا انکار کر رہے ہو جس نے تمہیں مٹی سے بنایا، پھر نطفہ سے، پھر تمہیں مکمل مرد بنایا، لیکن وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤں گا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو کہتے": جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور اللہ کی مدد کے بغیر کسی کی کوئی طاقت نہیں" اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں مال اور اولاد میں تم سے کم ہوں، تو وہ دن دور نہیں کہ میرا رب مجھے تم سے بہتر باغ عطا فرمائے اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی عذاب بھیج دے تو وہ چٹیل چکنا میدان بن جائے یا اس کا پانی زمین میں دھنس جائے اور تم اسے ہرگز تلاش نہ کر سکو۔ اور اس شخص کے پھل (عذاب میں) گھیر لیے گئے۔ اور اس نے اس باغ میں جو کچھ خرچ کیا تھا، وہ اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا۔ وہ باغ اپنی چھپریوں پر گرا پڑا تھا اور وہ شخص کہہ رہا تھا: کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا" اور اس کے پاس کوئی جماعت نہیں تھی جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتی اور نہ ہی وہ بدلہ لینے کے قابل تھا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اختیارات اللہ ہی کے پاس ہیں جو سچا ہے۔ وہی سب سے اچھا بدلہ دینے والا ہے اور اسی کے پاس بہترین انجام ہے۔ اور آپ ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کیجئے جیسے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا تو اس کے سبب زمین کا ملا جلا سبزہ نکلا پھر وہ سوکھ کر چورا چورا ہو گیا۔ جس کو ہوا اُڑا دیتی ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے رب کے پاس از روئے ثواب اور امید کے بہت بہتر ہیں۔ (الکھف: 28 تا 46)

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات انسان دنیاوی مال و دولت اور

شان و شوکت کو اللہ کی بارگاہ میں مقبولیت اور محبوبیت کا سبب سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کے ذہن میں خناس سما جاتا ہے کہ اگر بالفرض قیامت قائم بھی ہوگئی تو وہاں بھی میرے وارے نیارے ہوں گے کیونکہ میں تو اللہ کا محبوب ہوں لیکن انسان اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ مال، دولت اور اولاد تو دنیاوی زندگی کی زینت اور امتحان ہیں۔ اسی بات کو سورۃ التغابن آیت 15 میں اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ

ترجمہ: "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں۔ اور اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔"

نیز کوئی یہ بھی نہ سمجھے کہ کسی کا نادار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

سورۃ الانعام آیت نمبر 52 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ ۖ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ

ترجمہ: " اور ان (نادار مسلمانوں) کو (اپنے سے) دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی رضا چاہتے ہوئے اس کی عبادت کرتے رہتے ہیں، ان کا حساب بالکل آپ کے ذمہ نہیں ہے اور آپ کا حساب سرِ مو ان کے ذمہ نہیں ہے۔ پس اگر آپ نے ان کو دور کر دیا تو یہ کام انصاف سے بعید ہوگا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت سے افراد پراگندہ حال نظر آئیں گے، لوگ انہیں اپنے دروازوں سے دھتکار دیں گے۔ (لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ) اگر وہ اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ انہیں قسم میں سچا ثابت فرماتا ہے (صحیح مسلم)

مصعب بن سعد بیان فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے گمان کیا کہ انہیں (شجاعت اور سخاوت کی وجہ سے) اپنے سے کمتر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: فرمایا تمہیں جو نصرتِ الٰہی اور رزق کی کشادگی ملتی ہے تو یہ کمزوروں کی دعاؤں کی برکت سے ملتی ہے (صحیح مسلم)

بعض اوقات انسان اپنے سے برتر لوگوں کو دیکھ کر احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جب کوئی مال اور صورت و شکل میں اپنے سے بہتر کو دیکھے تو وہ اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر ڈالے تاکہ وہ اللہ کا شکر گزار بندہ بن سکے۔" (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے سے کم تر لوگوں کو نظر میں رکھو، اپنے سے برتر لوگوں کو للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھو، اس طرح تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری سے محفوظ رہو گے۔ (صحیح مسلم)

حضرت سہیل بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا: تم اس شخص کے متعلق کیا کہتے ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ شخص اس لائق ہے کہ اگر یہ نکاح کا پیغام دے تو اسے قبول کیا جائے۔ اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے، اگر یہ کوئی بات کرے تو اس کی بات توجہ سے سنی جائے۔ حضرت سہیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر آپ خاموش ہو گئے۔ پھر فقراء مسلمین میں سے ایک شخص کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: اس شخص کے متعلق تم کیا کہتے ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یہ شخص اس لائق ہے کہ اگر یہ نکاح کا پیغام دے تو اس کا نکاح نہ کیا جائے، اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش نہ مانی جائے۔ اگر یہ کوئی بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (تھوڑی دیر پہلے جس شخص کی تم تعریف کر رہے تھے) اگر اُس جیسے لوگوں سے زمین بھر جائے تب بھی یہ ایک شخص اُن سب سے بہتر ہے (صحیح بخاری)

دنیاوی زیب و زینت کے بے وقعت ہونے اور نیک اعمال کے نفع بخش ہونے کی مثال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۃ الرعد آیت 17 میں فرماتے ہیں۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

ترجمہ: "اس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے اپنی مقدار میں نالے بہنے لگے پھر وہ سیلاب پھولا ہوا جھاگ اوپر لایا، اور جس چیز کو آگ میں زیور یا کسی اور اسباب بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں اس پر بھی ویسا ہی جھاگ ہوتا ہے، اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، پھر جو جھاگ ہے وہ یونہی جاتا رہتا ہے، اور جو لوگوں کو فائدہ دے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔"

سورۃ الحشر آیت نمبر 18 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

ترجمہ: "اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہر شخص سوچ لے کہ کل (صبح قیامت) کے لیے وہ کیا آگے بھیج رہا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب باخبر ہے"

گویا ہمیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی بہت مختصر ہے۔ جیسے صرف ایک دن کی زندگی۔ رات کو سوئے، صبح آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ قیامت کا دن ہے۔ لہٰذا کل صبح تمہارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اس کے لیے ہر وقت فکرمند رہو کہ کیا تیاری کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))

"دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی ہو یا راستہ عبور کرنے والا مسافر"

یا راستہ عبور کرنے والے (یعنی اسے اپنی مستقل قرار گاہ نہ سمجھو) پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے۔ جب تم شام کر لو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب تم صبح کر دو تو شام کا انتظار نہ کرو اور اپنی تندرستی کے زمانے میں اپنی (ممکنہ) بیماری کے لیے کچھ پس انداز کر کے رکھو اور اپنی حیات سے اپنی موت (یعنی عاقبت) کے لیے کچھ تیاری کر کے رکھو (صحیح بخاری)۔

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ أُصْبُعَهُ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ!)) (مسلم)

"کہ دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے کہ جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے اور پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) (رواہ مسلم)

"دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔"

درج بالا حدیث دنیا اور آخرت کی زندگی پر ایک اور زادیے سے روشنی ڈال رہی ہے۔ قید خانہ کی زندگی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قیدی اپنی زندگی میں آزاد نہیں ہوتا بلکہ ہر معاملہ میں جیل کے داروغہ کے حکم کی پابندی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب کھانے کو دیا گیا اور جو کچھ دیا گیا، کھالیا، جو پینے کو دیا گیا، پی لیا، جہاں بیٹھنے کا حکم دیا گیا بیٹھ گیا، جب کھڑے ہونے کو کہا گیا کھڑا ہو گیا۔

الغرض قید خانہ میں اپنی مرضی بالکل نہیں چلتی بلکہ جیلر کے حکم کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ دوسری خصوصیت قید خانہ کی یہ ہے کہ قیدی اس سے جی نہیں لگاتا اور اس کو اپنا گھر نہیں سمجھتا بلکہ ہر وقت اس سے نکلنے کا خواہش مند رہتا ہے۔ اس کے برعکس جنت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں متقیوں کے لیے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ہر جنتی اپنی مرضی کی زندگی گزارے گا اور اس کی ہر خواہش اور تمنا پوری ہوگی۔

گویا یہ حدیث ہمارے لیے ایک آئینہ ہے جس میں ہر مومن اپنا جائزہ لے سکتا ہے اگر اس کے دل کا تعلق اس دنیا کے ساتھ وہ ہے جو ایک قیدی کا ہوتا ہے تو وہ مومن ہے اور اگر اس نے اس دنیا سے اپنا دل ایسے لگا لیا ہے کہ اسی کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیا ہے تو اس کا یہ حال کا فرانہ ہے۔

عَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: ((مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِآخِرَتِهِ، وَمَنْ اَحَبَّ آخِرَتَهُ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَآثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى۔)) (مسند احمد: 19933)

"(سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنی دنیا سے محبت کی، اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا، جس نے اپنی آخرت کو پسند کیا، اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا، پس تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔)"

ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کو اپنا محبوب و مطلوب بنائے گا تو اس کی اصل فکر و سعی دنیا ہی کے لیے ہوگی اور آخرت کو یا تو وہ بالکل ہی پسِ پشت ڈال دے گا یا اس کے لیے بہت کم جدوجہد کرے گا جس کا نتیجہ بہر حال آخرت کا خسارہ ہوگا۔ یہی بات سورۃ الکہف آیت نمبر 103 تا 104 میں بھی فرمائی گئی ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: "(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ فرما دیجئے کہ: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کون لوگ اپنے اعمال میں سب

سے زیادہ ناکام ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کی ساری دوڑ دھوپ دنیاوی زندگی کے لیے رہی اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔"

دوسری طرف جو شخص آخرت کو مطلوب و محبوب بنائے گا اس کی اصل فکر و سعی آخرت کے لیے ہوگی اور وہ ایک دنیا پرست کی طرح دنیا کے لیے جدوجہد نہیں کر سکے گا اس طرح اپنی دنیا کا نقصان کرے گا۔

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ، مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا، إِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى، وَمَا وَالَاهُ، وَعَالِمًا وَّمُتَعَلِّمًا)) (ترمذی)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس پر خدا کی پھٹکار ہے سوائے خدا کی یاد کے اور ان چیزوں کے جن کا خدا سے کوئی تعلق اور واسطہ ہے اور سوائے عالم اور متعلم کے۔"

یعنی اس دنیا میں صرف وہی چیزیں اور اعمال اللہ کی رحمت کے لائق ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے اور دین سے کوئی تعلق ہو۔ برخلاف اس کے جو چیزیں اور اعمال اللہ اور دین سے بے تعلق ہیں (اور دراصل دنیا ان ہی کا نام ہے) وہ سب اللہ کی رحمت سے محروم اور قابلِ لعنت ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا کوئی ایسا ہے کہ پانی پر چلے اور اس کے پاؤں نہ بھیگیں؟ عرض کیا گیا حضرت! ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح دنیادار گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا (رواہ البیہقی شعب الایمان)

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو دنیا سے اس کو اس طرح پرہیز کراتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے مریض سے پرہیز کراتا ہے۔ جبکہ اس کو پانی سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ (رواہ البخاری)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اپنے اس خطبہ میں ارشاد فرمایا: "سن لو اور یاد رکھو کہ دنیا ایک عارضی اور وقتی سودا ہے جو فی الوقت حاضر اور نقد ہے (اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اسی لیے) اس میں ہر نیک و بد کا حصہ ہے اور سب اس سے کھاتے ہیں۔ اور یقین کرو آخرت مقررہ وقت پر آنے والی ایک سچی اٹل حقیقت ہے اور مکمل قدر و قیمت رکھنے والا شہنشاہ اس میں (لوگوں کے اعمال کے مطابق) جزا و سزا کا فیصلہ کرے گا۔ یاد رکھو کہ ساری خیر، خوش گواری

اوراس کی تمام قسمیں جنت میں ہیں اوراور سارا شر، دکھ اوراس کی تمام قسمیں دوزخ میں ہیں۔ پس خبردار! خبردار (جو کچھ کرو) اللہ سے ڈرتے ہوئے کرو (اور ہر عمل کے وقت آخرت کے انجام کو پیش نظر رکھو) اور یقین کرو کہ تم اپنے اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور میں پیش کیے جاؤ گے۔ پس جس شخص نے ذرہ برابر بھی کوئی نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی کوئی برائی کی ہوگی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔"

حُبِّ دنیا کا علاج

حُبِّ دنیا کی اصل میں دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ انسانی نفس کو آرام، آسائش و آرائش بہت محبوب ہیں۔ اور دوسری یہ کہ انسانی نفس یہ چاہتا ہے کہ اس کے آرام و آسائش اور نعمتوں میں بھی کمی نہ ہو۔ کبھی کوئی تکلیف یا پریشانی نہ ہو اور اس کی یہ نعمتیں اسے مستقل ملتی رہیں۔ لہٰذا انسان کو اپنے نفس کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ دونوں اعتبارات سے یہ دنیا ناقص ہے۔ نعمتوں کا دوام صرف جنت ہی میں ہوسکتا ہے اور خوبی کے اعتبار سے بھی جنت ہی کی نعمتیں زیادہ افضل ہیں۔ اور اس کے لیے انسان کو لازماً مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں درج ذیل اعمال بھی دنیا کی محبت کو کم کرنے میں مددگار رہوں گے۔

1۔ **انفاق:** بہت بنیادی ضروریات سے زیادہ مال و اسباب اللہ کی راہ میں خرچ کردینا، انفاق کا وہ درجہ ہے، جس کا پسندیدہ ہونا تو شرعاً بھی ثابت ہے۔ تاہم حُبِّ دنیا کے علاج کے لیے اسے لازماً سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہر وہ زائد از ضرورت چیز فوری طور پر کسی مستحق کو دے دی جائے جس کی طرف نفس میں رغبت پائی جاتی ہو۔

2۔ **گھر میں دنیا کی باتیں نہ کرنا:** مثلاً اولاد سے اس طرح گفتگو نہ کریں کہ تمہیں لازماً ڈاکٹر بنانا ہے یا انجینئر بلکہ ان کے مستقبل کے بارے میں اس طرح گفتگو کریں کہ تمہیں لازماً ہر حال میں مسنون زندگی گزارنی ہے خواہ اس کا نتیجہ دنیاوی تنگی ہی کیوں نہ ہو۔

3۔ **موت کی یاد:** قبر کا دھیان اور قبرستان میں باقاعدگی سے عبرت کے حصول کے لیے جانا۔

4۔ ہر جمعہ کو سورۃ الکہف کا ترجمہ و تفسیر کے ساتھ بغور مطالعہ خصوصاً اس کا پہلا اور آخری رکوع۔

آیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں آخرت کے نقطۂ نظر سے اور آخرت کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے اور دنیا و مافیہا کی محبت ہمارے دلوں سے نکال دے۔ آمین یارب العالمین!

رزق حرام

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا ہے اور یہاں انسان کو زندگی گزارتے ہوئے کئی طرح کے معاملات کا سامنا ہے۔ انسان کی کچھ بنیادی ضروریات ہیں۔ جیسے غذا، لباس، رہائش اور تعلیم وغیرہ۔ نسل انسانی کے ارتقاء کے لیے اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ انسان شادی کرتا ہے اولاد پیدا ہوتی ہے ایک گھر بنتا ہے۔ اس گھر کو چلانے کے لیے وسائل درکار ہیں۔ انسان کی ضروریات کے ساتھ ساتھ انسان کی بے شمار خواہشات بھی ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی طلب ہے۔ جس کے لیے مال و اسباب درکار ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر جو کچھ ہے انسان کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے حصول کے لیے کچھ حدود و قیود مقرر فرمادی ہیں اور حلال اور حرام کے احکام نازل فرمائے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص حرام مال حاصل کرے گا اور اس سے (اپنی ضروریات میں) خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہیں ہوگی اور اگر اس مال سے صدقہ دے گا تو (عند اللہ) قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور ترکہ میں اس مال کو چھوڑ کر مرے گا تو وہ (مال) اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا۔" (مسند احمد)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کے دن سب سے حسرت ناک انجام اس شخص کا ہوگا جس نے دنیا میں حرام مال کمایا ہوگا اور وہ اسے جہنم میں لے جائے گا۔ (مسند احمد بن حنبل)

حرام چیزیں دو طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ لیکن کسی حکمت کی بناء پر اس کا کھانا حرام کردیا ہے۔ جیسے مردار، بہتا ہوا خون یا خنزیر اور جو چیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کی گئی ہو۔ دوسرے وہ چیزیں جو اصل میں تو حلال تھیں مگر انسان نے خود (اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کرکے) اپنے لیے حرام بنالیا۔ جیسے چوری کا مال یا جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر کمایا ہوا مال۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال حرام کی قباحت کو اس انداز میں ذکر فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکیزہ مال ہی قبول کرتا ہے اور اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو بھی اسی چیز کا حکم دیتا ہے، جس کا حکم اپنے پیغمبروں کو دیا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیات تلاوت فرمائیں:

يَآاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (المومنون:51)

ترجمہ: "اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو مجھے اس کا پورا علم ہے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ فرمایا جو دور دراز کا سفر کر کے آیا ہو، اس کے چہرے پر سفر کے اثرات ہوں، اس کے لباس پر مٹی ہو، چہرے اور بالوں پر مٹی ہو اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا ہو۔ اے میرے رب! اے میرے رب! اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ اس کا کھانا حرام کا، اس کا پینا حرام کا اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی۔ (مشکوٰۃ)

معلوم ہوا کہ اعمال اور دعاؤں کی قبولیت میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حرام کا مال ہے۔

جس طرح حرام سے بچنا ضروری ہے اسی طرح شک وشبہ کی کمائی اور مشکوک مال سے بھی بچنا ضروری ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "حلال ظاہر ہے حرام ظاہر ہے اور اس حلال وحرام کے بیچ میں شبہ والی چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ آیا وہ حلال ہیں یا حرام ہیں۔ پس جو شک وشبہ والی چیزوں سے بچا، اس نے اپنے دین کو بچا لیا اور جو ان شبہ والی چیزوں میں پڑ گیا تو اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو شاہی چراگاہ کے پاس اپنے جانوروں کو چرائے۔ قریب ہے کہ کوئی جانور اس میں گھس جائے۔

"خبردار! ہر ایک بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہے جس میں دوسرے کے جانوروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ (یعنی یہ زمین اللہ تعالیٰ کی چراگاہ کی طرح ہے۔ تاکہ اس کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھائے۔ البتہ بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود وقیود قائم فرمادی ہیں۔) خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ درست رہا تو سارا جسم درست رہا، جب وہ خراب ہوگیا تو سارا جسم خراب ہوگیا، سن لو! وہ دل ہے۔" (بخاری)

ہمارے اسلاف حلال میں بڑی تحقیق کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مشتبہ شے کھالی تو معلوم ہوجانے پر حلق میں انگلی ڈال کر فوراً قے کر دی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ کیا کروں کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنی خوراک پاکیزہ رکھو، تمہاری دعائیں قبول ہوں گی۔"

رزقِ حرام میں مقدار زیادہ ہونے کے باوجود بھی برکت نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ اس حرام مال کی وجہ سے کسی شخص کو ایسی پریشانیوں یا مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہی مال، جو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور ظلم وزیادتی سے کمایا تھا، اس کی تباہی وبربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

موجودہ نظامِ معیشت میں بہت سی چیزیں تو واضح طور پر حرام اور ناجائز ہیں۔ جنہیں تمام علماء نے بھی حرام قرار دیا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:-

(i) تمام بنک اکاؤنٹس کا سود/منافع

(ii) حرام اور ممنوعہ چیزوں کی تجارت مثلاً کمپیوٹر نیٹ کیفے جہاں بیٹھ کر لڑکے لڑکیاں فلمیں دیکھتے ہیں۔ ایسی موبائل کی دکانیں جہاں گانے اور فلمیں ریکارڈ کر کے بیچے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں شراب کی دکانیں وغیرہ۔

(iii) فحش اور لادینی کتابوں اور رسالوں کی فروخت۔

(iv) فلموں کا کاروبار۔

(v) منشیات کی خرید وفروخت۔

(vi) ملازم کا اپنا کام دیانتداری سے نہ کرنا۔

(vii) رشوت لینا۔

(viii) رشوت دے کر ناجائز کام کرانا۔

(ix) لاٹری

(x) انشورنس سکیموں کے فوائد

(xi) بنک سے سود قرض لے کر کاروبار کرنا

بعض چیزوں کی حرمت پر خود علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ لہٰذا وہ ہم مشکوک چیزوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ بیان ہوچکا کہ ہمیں شبہ والی چیزوں سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ ان میں چند درج ذیل ہیں:-

i. بلاسود بینکاری کا منافع۔

ii. تمام انعامی سکیمیں جن کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جاتا ہے۔

iii. اسٹاک مارکیٹ کا کاروبار۔

iv. اکثر کمپنیوں کے شیئرز پر ملنے والا منافع۔

v. لہو ولعب کو ترویج دینے والے سامان کی تجارت۔

vi. تراویح پڑھانے کی اجرت۔

vii. کثرتِ رزق کے لیے کافر مالک کے غیر اسلامی ماحول میں جا کر ملازمت کرنا۔

viii. کریڈٹ کارڈ کا استعمال۔

ix. تمام سیونگ سرٹیفکیٹس۔

x. عورتوں کی وہ تمام ملازمتیں جہاں بلا ضرورت بے پردگی لازمی ہو جائے۔

xi. عورتوں کی تصویر والی چیزوں کی خرید و فروخت۔

xii. عورتوں کے نیم عریاں/ باریک کپڑے تیار کرنے اور غیر اسلامی ڈیزائن میں سلائی۔

جدید دنیا میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو انسانی زندگی کے بارے میں دینی مؤقف کو سمجھنے کی یا تو اہلیت ہی نہیں رکھتا یا اس حمیّت سے محروم ہے جس کے بغیر دینی سوچ پنپ ہی نہیں سکتی۔ مذکورہ بالا مسائل میں امت کے مجموعی مؤقف سے اختلاف یا انحراف کرنے والے لوگ اسی قبیل سے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک دنیاوی ترقی اور خوشحالی گویا مدارِ حق بن گئی ہے اور دین سے پیدا ہونے والی انسانی تہذیب اور اس کے بنیادی عوامل ان حضرات کی نظر سے بالکل اوجھل ہیں یا پھر یہ ان کی طرف دیکھنے سے کتراتے ہیں۔ اصول کی بات یہی ہے کہ اس امت کو اگر اپنی ہیئت اجتماعی کو برقرار رکھنا ہے تو پھر مشتبہات کے پھیلاؤ سے بھی بچنا پڑے گا۔

رزقِ حرام کے نقصانات:

1- انسان کے جوہر میں غیرت اور حیا کا ایک مادّہ ہوتا ہے۔ رزقِ حرام سے پہلی ضرب اسی پر پڑتی ہے۔ ایک دینی شخصیت کی تشکیل میں حمیّت اور عفت ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسبِ حرام سے یہ ستون گر جاتے ہیں۔

2- حرام کمائی کے نتیجے میں معیارِ زندگی میں جو بلندی پیدا ہوتی ہے، وہ فخر اور تکبر کا یقینی سبب بنتی ہے۔ حرام کی دولت پر اکڑنا تو اسلام سے نکلنے کے مترادف ہے۔ اس میں اور ابوجہل کی اکڑ میں کوئی فرق نہیں۔

3- شرک اور تکبر کے بعد اسلام جس چیز کو پہلے قدم پر ہی ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے، وہ حبِّ دنیا اور حبِّ مال ہے۔ اسلام اور حبِّ دنیا اسی طرح متضاد ہیں جیسے ایمان اور کفر۔ رزقِ حرام کمانے والا دین کے اس بنیادی مطالبے یعنی حبِّ دنیا کے ترک کو نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ اس امّ المعاصی (گناہوں کی ماں) کو عملاً دین پر ترجیح دینے کا عادی بن جاتا ہے۔

4- مسلمان اور رزقِ حلال میں وہی نسبت ہے جو مرد اور مردانگی میں ہے۔ رزقِ حرام کی دلدل میں

پھنسنے والا مردانگی کے تمام اوصاف سے دست برداری اختیار کر لیتا ہے۔ اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے جہاں انسان ہر چیز کا سودا کر سکتا ہے۔

5- کسبِ حلال اور اس کے لیے کی جانے والی کوششیں آدمی کو بندگی کی فطری روح کے ساتھ اپنے رب کے ساتھ جوڑے رکھتی ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کرنے سے اللہ سے تعلق کی حقیقی اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ شکر، صبر اور توکل جیسے اوصاف ختم ہو جاتے ہیں۔

6- اس کی نحوست تمام زیرِ کفالت افراد (بیوی، بچے وغیرہ) کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

7- اس کا ہر دینی عمل یقیناً بے سود اور بے معنی ہو جاتا ہے۔

8- اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

9- مال میں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

10- عبادت میں دل نہیں لگتا اور ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔

اگر ہم اپنی اصلاح چاہتے ہیں تو ہمیں دو کام تو فوری کرنے ہوں گے۔

- گریہ وزاری کے ساتھ توبۃ النصوح۔
- تمام حرام اموال و املاک سے فوری دستبرداری۔

حرام مال سے جتنا فائدہ اٹھایا جا چکا ہے۔ اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بھی درج ذیل کام ضروری ہیں۔

- مسلسل استغفار
- حلال کمائی سے حسبِ استطاعت اللہ کے راستے میں خرچ
- جس کا مال حرام طریقے سے لیا ہے اس کو واپس کیا جائے اور اگر اس کا نام معلوم نہ ہو یا اس تک پہنچانا ناممکن ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔

ان کاموں کو کرنا بالکل مشکل نہ سمجھیں۔ آخرت میں جو پکڑ ہونی ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ مشقت کچھ بھی نہیں ہے۔

آیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں رزقِ حرام سے محفوظ رکھے۔ آمین یا رب العالمین

اسراف وتبذیر

اسراف عام طور پر فضول خرچی کو کہتے ہیں اور اسے مالی امور سے متعلق ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر دراصل یہ ایک ایسی باطنی بیماری ہے جو انسان کو مالی وغیر مالی امور میں شریعت کی مقرر کردہ حدود میں نہیں رہنے دیتی۔ یعنی اسراف کا اصل مطلب ہے" حد سے تجاوز کرنا" مالی امور میں اسراف کا مطلب ہوگا کہ ایسا خرچ جس کا کوئی دینی ودنیاوی فائدہ نہ ہو محض اپنے نفس کی خواہش پر اور اپنے نفس کی راحت کے لیے کیا جائے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے دل کھول کر خرچ کرنا اسراف نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

سورۃ الاعراف آیت نمبر 31 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

ترجمہ:" اور کھاؤ اور پیو مگر فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"

فقہائے کرام نے شریعت کے مقاصد کے تحت انسان کے خرچ کرنے کی تین اقسام بیان کی ہیں۔

ضروریات:

سب سے پہلے نمبر پر" ضروریات" ہیں یعنی وہ امور جن پر دینی ودنیاوی بقا موقوف ہے۔ مثلاً دین کا تحفظ، جیسے نماز پڑھنے کے لیے کم از کم ستر پوش لباس ضروری ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے اور گھر کی ضرورت ہے۔ بیمار ہو جائیں تو علاج کی ضرورت ہے۔ عقل کے تحفظ کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

حاجات:

ان میں ایسے امور شامل ہیں جو زندگی اور موت کا مسئلہ تو نہیں ہوتے لیکن ان کا تعلق تنگی و راحت، مشکل وآسانی سے ہوتا ہے۔ یعنی اب ستر پوش لباس سے آگے بڑھ کر ایسا ساتر لباس جو دیکھنے میں بھلا لگتا ہو، پورا جسم ڈھانپے، موسم کی مناسبت سے لباس ہو۔ رہن سہن میں اچھی اور

معیاری اشیاء استعمال کرنا۔

تحسینیات:

اچھے روزگار کے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول، رہائش اور رہن سہن میں" ضروریات" اور" حاجات" سے دو قدم آگے بڑھ کر زیادہ بہتر اور پُر آسائش انداز میں زندگی بسر کرنا۔

اسراف کا تعین کرتے ہوئے دو باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ شریعت نے" ضروریات" سے آگے بڑھ کر" حاجات" اور" تحسینیات" کی بھی رعایت دی ہے۔ دوم یہ کہ اپنی آمدنی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا جیسے اردو میں کہاوت ہے" چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" اور انگریزی میں کہتے ہیں" Cut your Coat according to your size"۔

" تحسینیات" کے حوالے سے یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جب دین مغلوب ہو تو ہمیں اپنے تمام وسائل اور تمام توانائیوں کا زیادہ تر حصہ غلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے صرف کرنا چاہیے اور کم تر حصہ اپنی معاش پر خرچ کرنا چاہیے۔ اگر ہم نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے کس طرح پیوند لگے لباس زیبِ تن کر کے اور فاقے کر کر کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے اپنا سارا مال حضور اکرم ﷺ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ چاہتے تو وہ بھی اس مال کو کاروبار میں لگا کر ایک پُر آسائش زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے تمام مال راہِ خدا میں خرچ کر دیا۔

اسراف کی مختلف شکلیں:

اسراف کا ذکر سن کر سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ مال ودولت اور پیسہ خرچ کرنے کے بارے میں آتا ہے۔ اسراف اس کے علاوہ بھی بہت سی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

مالی معاملات میں اسراف:

ہر شخص خود ہی اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ کس چیز کی مجھے کس حد تک ضرورت ہے اور کہاں ضرورت کی حد ختم ہو کر اسراف کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمیں ایک چپل گھر میں پہننے کے لیے اور ایک جوتا باہر پہن کر جانے کی ضرورت ہے۔ اب اگر ہم مختلف تقریبات میں پہننے کے لیے

مختلف جوڑے یا عورتیں ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ جوتے خریدنے لگیں تو یہ اسراف میں شمار ہوگا۔

اسراف کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ گھرانہ چھوٹا ہے لیکن رہنے کے لیے بہت بڑے بڑے گھر تعمیر کر لیے جاتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے واش رومز، ڈرائنگ رومز اور بیڈ رومز اور ان میں انتہائی اعلیٰ کوالٹی کے ساز و سامان اور بڑے بڑے فانوس ہیں۔ اسی طرح وارڈروب میں 15-20 جوڑے لٹک رہے ہیں جن میں سے بعض کی پہننے کی نوبت سالوں بعد آتی ہو تو یہ بھی اسراف ہے۔

خوشی اور غمی کے موقع پر وقت کا اسراف:

ہم خوشی کے موقع پر جائز حد سے آگے بڑھ کر بے پناہ خوشیاں منانے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بلند آواز قہقہے، ٹھٹھا مذاق، آتش بازی، نوٹوں کا وار پھیر، ڈانس پارٹی وغیرہ یہ سب جذبات وقت اور پیسے کا اسراف ہے۔ اسی طرح غمی کے موقع پر دھاڑیں مار مار کر رونے کی ایکٹنگ کرنا یا بین کرنا یہ بھی جذبات کا اسراف ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ہمیں شادی بیاہ اور مرگ کے مواقع پر خوشی منانے کا طریقہ اور اسی طرح غم کے اظہار کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ اگر ہم نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں تو حیران رہ جائیں گے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بہت بیمار تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ ان کا آخری وقت ہے مگر نبی اکرم ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس اسی حالت میں چھوڑ کر غزوۂ بدر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ نہیں کہ بیٹی کی فکر نہیں تھی بلکہ غلبہ دین کی جدوجہد کی اہمیت ہی اتنی زیادہ ہے۔

بے شک اسلام میں سوگ تین دن کا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سب کام کاج چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ انسان کو چاہیے کہ جلد از جلد کام کاج میں مصروف ہو جائے تاکہ زندگی معمول پر آجائے۔ مزید برآں چلتے پھرتے میت کے لیے مغفرت کی دعا بھی کرتے رہیں۔

عام زندگی میں وقت کا اسراف:

ہم اپنی عام زندگی میں وقت کا بہت اسراف کرتے ہیں۔ جو کام 10 منٹ میں ہو سکتا ہے اس پر ایک ایک دو دو گھنٹے ضائع کر دیتے ہیں۔ بننے سنورنے میں، نہانے دھونے میں،

بازاروں میں گھومنے پھرنے میں، فون پر غیر ضروری لمبی لمبی گفتگو کرنے میں بہت سارا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ گھر میں بیٹھے موبائل پر گیمز کھیلنے میں یا کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے ہم گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم وقت کی قدر کریں۔ دنیا میں ہم آخرت کمانے کے لیے آئے ہیں تو وقت ہی ہماری سب سے بڑی متاع ہے۔ اگر آخرت کا پختہ یقین ہر وقت ذہن میں تازہ رہے گا تو وقت کی قدر آئے گی۔

قدرتی وسائل میں اسراف:

قدرتی وسائل (بجلی، گیس پانی وغیرہ) کے استعمال میں بھی ہمیں کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ بلاوجہ گھر میں بڑے بڑے قمقمے اور شینڈلر (فانوس) لگا کر بجلی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ جس کمرے میں ہوں اس کمرے کی لائٹ اور پنکھا چلا لیں اور کمرے سے نکلتے ہوئے لائٹ بجھا دیں۔ اسی طرح لوگ شادی بیاہ کی تقریبات، 12 ربیع الاول یا ختم قرآن کی محفلوں میں لائٹنگ کرواتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ضیاع ہے۔

یہی معاملہ گیس کا ہے۔ ضرورت کے مطابق چولہے کی آنچ رکھیں۔ کھانا پکانے کے فوراً بعد گیس بند کر دیں۔ کمرے سے نکلتے ہوئے ہیٹر آف کر دیں۔

پانی تو ہم بہت ہی ضائع کرتے ہیں۔ وضو کرتے ہوئے ہم نل پورا کھول دیتے ہیں جب تک ہاتھوں پر صابن لگایا، مسواک کرتے ہوئے، ناک صاف کرتے ہوئے، سر پر مسح کرتے ہوئے بلاوجہ پانی بہتا رہتا ہے۔ ہمارے بزرگ تو ایک لوٹے پانی سے وضو کر لیا کرتے تھے۔ ایک ہاتھ سے پانی لیتے دوسرے سے دھو لیتے۔ مسواک کرتے ہوئے، مسح کرتے ہوئے پانی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہمیں حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ نل کو تھوڑا کھولیں۔ پانی کم استعمال کریں۔ خواہ وضو کرنے میں دو تین منٹ زیادہ لگ جائیں۔ مگر اسراف نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا تو آج قدرتی وسائل کی کمی کا رونا رو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ پانی کے استعمال میں کمی کریں۔ صاف پانی کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں تو نبی اکرم ﷺ نے 1400 سال پہلے اس بارے میں تلقین فرما دی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو پانی (کسی کنویں یا ندی) کے کنارے بیٹھے وضو کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں اسراف نہ کرو اس نے کہا اس میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا

ہاں! اور اگر دریا کے کنارے بھی وضو کر رہے ہو تب بھی اتنا ہی پانی استعمال کرو جتنا ضرورت ہو۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے رات کو سونے سے پہلے چراغ بجھانے کی ہدایت فرمائی۔

لہٰذا ہمیں عبادت سمجھ کر پانی، گیس اور بجلی کو بچانا چاہیے۔ کہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ضائع نہ ہوں۔ ناشکری اور ناقدری نہ ہونے پائے۔ نعمتوں کے ضائع کرنے سے بچانے کو کنجوسی نہیں، ثواب کا کام ہے۔

کھانے میں اسراف:

کھانے پینے میں اسراف یہ ہے کہ شکم پروری ہونے لگے۔ انسانی جسم کی دو بنیادی ضرورتیں قوت اور فرحت غذا سے پوری ہوتی ہیں اور انہیں پورا ہونا بھی چاہیے۔ دینی نقطہ نظر سے جسم کی قوت ضروری اعمال بجالانے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی خاص کھانے کے لیے خود کو مصیبت اور مشکل میں ڈالے یا خوب اچھی طرح پیٹ بھر کے کھانے کے باوجود کھانے کی رغبت کم نہ ہو یا پلیٹ میں اتنا زیادہ کھانا نکال لیا جائے کہ ختم نہ ہو اور بالآخر کھانا ضائع ہو جائے تو یہ اسراف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے کھانے کے لیے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں ہم دوسروں کو بھی شریک کریں۔ یعنی جو کھانا ہماری ضرورت سے زائد بچ گیا ہے۔ اسے فریج میں محفوظ کر کے نہ رکھیں بلکہ ساتھ ساتھ اپنے ملازمین یا پڑوسیوں کو کھلا دیں۔ بسا اوقات فریج میں ہم چیز کو رکھ کر بھول جاتے ہیں اور رکھے رکھے خراب ہو جاتی ہے۔

کھانے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری صحت اچھی رہے اور اس طرح حاصل شدہ توانائی اللہ کے دین کے کاموں میں، غلبۂ دین کی جدوجہد میں صرف کریں۔ نہ یہ کہ ہم کھانے ہی کو زندگی کا مقصد بنالیں۔ آج کل ہر جگہ کھانے کے متعلق ہی منصوبہ بندی ہوتی رہتی ہے کہ کیا کھائیں کہاں جا کر کھائیں؟ KFC جائیں یا میکڈونلڈ۔ کھانا اللہ کے نام سے کھانا شروع کریں اور کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کریں۔ اتنا کھانا کہ وزن بڑھ جائے، شوگر اور بلڈ پریشر جیسی بیماریاں جنم لینے لگیں، سستی اور کاہلی پیدا ہو جائے تو یہ کھانے میں اسراف ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی کارپوریٹ دنیا نے اپنے منافع کی خاطر تشہیر بازی کے ذریعے پوری دنیا میں کھانے کا اسراف

پیدا کر دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ تم میں سے اگر کسی کا نوالہ زمین پر گر جائے تو اسے اٹھا کر جھاڑ کر کھالو۔ لہٰذا بسکٹ یا کوئی خشک چیز فرش پر گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھا لینی چاہیے۔ ہمارے یہاں اس کو خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ اس شرم سے زمین سے اٹھا کر نہیں کھاتے کہ لوگ کیا کہیں گے حالانکہ ایک سنت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں فخر محسوس کرنا چاہیے۔ اسی طرح پلیٹ میں صرف اتنا سالن نکالیں جو ہم ختم کر سکیں۔ شادی بیاہ اور دعوتوں میں بہت سا کھانا اور روٹیوں کے ٹکڑے چھوڑ دیے جاتے ہیں جو پھر کوڑے میں جاتے ہیں۔ یہ سراسر اسراف ہے۔ ہمیں بچوں کو بچپن ہی سے عادت ڈالنی چاہیے کہ "پلیٹ صاف کر کے اٹھنا ہے اور کھانا ضائع کرنا گناہ ہے۔"

تبذیر:

تبذیر اسراف سے بھی آگے کی شے ہے۔ اسراف تو یہ ہے کہ ایک چیز کی ہمیں ضرورت ہے مگر ہم نے ضرورت سے زائد جمع کر کے رکھ لی ہے۔ مثلاً دو چار لباس کے جوڑے انسان کی ضرورت ہے، لیکن اگر ہماری وارڈروب (Wardrobe) نت نئے ڈیزائن والے کپڑوں سے اس طرح بھری ہوئی ہو کہ ان میں سے اکثر سوٹ سالوں پہننے کی نوبت نہ آتی ہو تو یہ اسراف ہے، مگر تبذیر یہ ہے کہ جہاں سرے سے پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو وہاں صرف نمود و نمائش یا واہ واہ کروانے کے لیے پیسہ ضائع کر دیا جائے یا پیسہ ناجائز اور گناہ کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 26-27 میں ارشاد الٰہی ہے:

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا

ترجمہ: "اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو (ان کا حق) اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں مت اڑاؤ۔ یقین جانو کہ جو لوگ بیہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔"

یہ بے ہودہ، ناجائز اور گناہ کے کاموں میں خواہ مخواہ مال اڑانا "تبذیر" کہلاتا ہے۔ تبذیر کرنے والوں کو قرآن مجید شیطان کے بھائی اس لیے قرار دیتا ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے

دوسرے لوگ بھی فتنے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جب ایک غریب شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس شخص کے پاس اتنا مال ہے کہ یہ بے دریغ مال اڑا رہا ہے اور میرے پاس کم از کم ضروریات کے لیے بھی رقم نہیں ہے تو ہوسکتا ہے اس کے دل کے اندر انتقامی جذبات پیدا ہوں اور وہ بھی چوری یا ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ دنیا میں بالعموم فتنے اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔

اسراف کے نقصانات:

1۔ ہدایت سے محرومی۔

سورۃ المومن کی آیت نمبر 28 میں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا (اور) جھوٹ بولنے کا عادی ہو۔"

اس کا مطلب ہے کہ باتوں میں بھی اسراف ہوتا ہے دراصل انسان جب بہت زیادہ بولتا ہے تو بعض اوقات بے خیالی یا بے دھیانی میں جھوٹ بول جاتا ہے۔ غیبت کر بیٹھتا ہے یا کسی کی چغلی کھاتا ہے۔

2۔ جب انسان اسراف سے کام لیتا ہے تو بسا اوقات اس کے پاس عین ضرورت کے وقت یا ہنگامی حالات میں خرچ کرنے کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ لہذا پریشان ہوتا ہے یا کسی سے قرض مانگتا ہے۔

3۔ خودنمائی اور دکھاوے کے مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

4۔ حُبِّ دنیا اور حُبِّ مال اس کے دل میں جگہ بنالیتی ہیں۔

5۔ آخرت کی فکر کا خاتمہ ہوجاتا ہے

6۔ انسان حصول مال کے لیے ناجائز ذرائع ڈھونڈنا شروع کردیتا ہے۔

7۔ نفس پرستی اور ہر صورت خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ خواہشات بڑھتی چلی جاتی ہیں اور قناعت ختم ہوجاتی ہے۔

8۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مستقل غفلت برتنے لگتا ہے۔

اسراف سے بچنے کی تدابیر:

1۔ خوفِ خدا اور تقویٰ۔

2۔ انفرادی محاسبہ کا خوف۔

3۔ سادگی سے زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا۔

4۔ خواہشات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرنا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں جتنا زیادہ تقویٰ کی روح اور خوف خدا ہوگا اور یہ تقویٰ اور خوفِ خدا بھی آخرت کے محاسبہ کے خوف سے ہی پیدا ہوگا اور جتنا زیادہ ہم اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی جدوجہد کریں گے، اتنا ہی زیادہ ہم اللہ کی پسند و ناپسند کے خیال رکھنے کی کوشش کریں گے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم اس کے بندوں سے محبت کریں، ان سے ہمدردی کریں۔ لہذا اپنے اخراجات میں حتی الامکان کمی لا کر ہی ہم اللہ تعالیٰ کے بندوں کی خدمت کرسکیں گے۔ اپنی خواہشات کو کنٹرول میں لائیں گے۔ خود اپنی زندگی سادگی سے گزارنے کی کوشش کریں گے تبھی تو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مدد کے قابل ہوسکیں گے۔

ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں ہمارے اندر اسراف وتبذیر کی کوئی علامت تو نہیں ہے۔ اگر محسوس ہو کہ ہمارے اندر بھی یہ عادت پائی جاتی ہے تو اسے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بھی عمل صالح ہے۔ اگر دین کے کاموں میں بہت زیادہ بھی خرچ کردیا تو یہ نیکی ہوگی اور اس کا بہت بڑا اجر ملے گا اور اگر گناہ کے کاموں میں ایک پیسہ بھی لگا دیا تو یہ اسراف ہوگا اور اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا، الا یہ کہ ہم توبہ کریں اور اپنی غلط عادتیں درست کرنے کی کوشش کریں۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم دین پر چلنے کا مصمم ارادہ کریں۔ اسراف پسندی کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنی آمدنی کا ایک مقرر حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کریں اور سادگی سے زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔

اے اللہ! اسراف کی عادت ہم سے چھڑا دے۔ اے اللہ! ہمیں اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین یارب العالمین

رسوم ورواج کی بے جا پابندی

رسوم ورواج کا تعلق انسان کی خوشی اور غمی سے ہے۔ ہر علاقہ اور قوم کی اپنی رسوم ورواج ہوتی ہیں۔ اسلام نے قومی، علاقائی اور خاندانی رسوم ورواج کو اکثر صورتوں میں برقرار رکھا ہے بشرطیکہ یہ شریعت کے کسی واضح حکم، محکم عقیدہ یا دین کے ساتھ وابستگی کی کسی بھی صورت سے متصادم نہ ہوں یا ان رسوم ورواج کے کرنے سے دین کی روح مجروح نہ ہوتی ہو۔ ایسی رسوم ورواج انسانی معاشرت میں خوبصورتی اور دلکشی پیدا کرتی ہیں اور انسانوں کو ذہنی اور نفسیاتی گھٹن سے محفوظ رکھنے میں بہت کارگر ثابت ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر ہمارے باپ دادا کے زمانے میں جب کسی گھر میں کوئی شادی کا موقع ہوتا تو مقامی رشتہ دار اور پڑوس کی عورتیں شادی والے گھر میں آکر کپڑے سیا کرتی تھیں۔ شادی کے موقع پر مہمانوں کے لیے پکنے والی دالیں اور چاول پہلے سے چھان پھٹک کر صاف کرتی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی ہوتا رہتا تھا۔ یہی عورتیں کھانے پکانے اور برتن دھونے میں بھی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ اس طرح نہ تو شادی والے گھر پر کوئی اضافی مالی بوجھ پڑتا اور نہ ہی گھر سے باہر نکل کر میرج ہال میں مہندی اور ناچ گانے ہوا کرتے تھے۔

ان رسوم ورواج کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ شادی بیاہ، غمی، بیماری یا کسی عزیز کی وفات کے موقع پر دور ونزدیک کے رشتہ دار اور احباب کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہی ہونے سے لوگ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم رسوم ورواج کو دین سے ٹکراؤ کی صورت میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ہم نے اکثر مباح رسومات کو بھی حرام یا کم از کم مکروہ تو ضرور ہی بنا لیا ہے۔ سچی دینداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ کم از کم ان رسومات سے تو فوری چھٹکارا حاصل کر لیا جائے جن میں ظاہر داری اور دکھاوا غالب ہے۔ اس کے بعد ان رسوم ورواج کی طرف بھی توجہ کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے جو کسی نہ کسی دینی ضرر کا موجب بنتی ہیں۔

شادی کی بے جا رسومات:

شادی بیاہ کی رسومات میں سب سے پہلی خرابی تو منگنی کی رسم میں ہے۔ علماء نے منگنی خفیہ رکھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کہیں فسادی اور حاسد لوگ منگنی کے تعلق کو خراب نہ کر دیں۔ علماء کے اس مؤقف کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے: اپنے کام پورے کرانے کے لیے معاملات کو خفیہ رکھ کر اللہ سے مدد چاہو (طبرانی)

لیکن ہمارے معاشرے میں منگنی کی رسم بھی خوب دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں۔ شادی بیاہ کی تمام رسومات میں ایک اور خرابی دکھاوا اور ظاہرداری ہے۔ دولہا اور دلہن کا زرق برق بھڑکتا ہوا لباس، دلہا کی سہرا بندی، گلے میں نوٹوں کے ہار، روپے پیسے کا وار پھیر اور فوٹو سیشن اس کے بعد بینڈ باجے کے ساتھ بارات روانہ ہوتی ہے۔ اکثر اوقات حیثیت نہ ہونے کے باوجود نئے ماڈل کی کار کرایہ پر منگائی جاتی ہے اور اسے سجایا جاتا ہے۔ یہ سب دکھاوا نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسری خرابی بے پردگی اور بے شرمی کی رسومات ہیں۔ دولہا کی بھابیاں دولہا کی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں اور اس سے پیسے بٹورتی ہیں۔ مہندی اور ابٹن کی رسومات میں عورتیں کھلے بال اور بغیر چادر کے لباس میں ہی میں ہوتی ہیں اور لڑکیوں اور لڑکوں کے اکٹھے ڈانس ہوتے ہیں اور اس نوع کی ہر علاقے کی بے شمار رسومات ہیں۔

تیسری خرابی مہنگائی کے باوجود پیسے کا اسراف ہوتا ہے۔ دولہا اور دولہن کے والدین کے ساتھ ساتھ مہمانوں پر بھی شادی میں شرکت بوجھ بن جاتی ہے۔ انہیں بھی پیسوں کے لفافے دینے پڑتے ہیں۔ کھانا بہت بڑی مقدار میں ضائع ہوتا ہے۔ اکثر اوقات غریب رشتہ داروں کو تو بلایا ہی نہیں جاتا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ ان رسومات کو پورا کرنے کی وجہ سے شادیاں بڑی عمر میں ہوتی ہیں۔ یا لڑکیاں شادی کے اخراجات نہ ہونے کی وجہ سے گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

پانچویں خرابی یہ ہے کہ بچوں اور بچیوں کی بلوغت کے بعد دیر تک شادی نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں بے راہ روی بڑھتی ہے۔ بے حیائی عام ہو جاتی ہے۔ زنا بالجبر اور جنسی ہراسگی کے واقعات ہوتے ہیں یا پھر لڑکے اور لڑکیاں ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔

فوتیدگی کی بے جا رسومات:

ہمارے معاشرے میں فوتیدگی کے موقع پر بھی بہت سی غیر مسنون رسومات رائج ہیں۔ میّت کو گھر کے صحن میں رکھ دیا جاتا ہے۔ رشتہ دار اور محلے کی خواتین رونے، پیٹنے اور بین کرنے ہی کو تعزیت سمجھتی ہیں۔ کفن پر ایک مخصوص چاک سے کلمہ طیبہ تحریر کیا جاتا ہے۔ دفن کرنے سے پہلے کفن میں "عہد نامہ" یا "شجرہ" رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر فوتیدگی کے تیسرے روز قل، ہر جمعرات کو فاتحہ، دسواں، چہلم اور ہر سال برسی منائی جاتی ہے۔ اور ہر موقع پر میت کے گھر والوں کو آنے والے رشتہ داروں اور احباب کی خاطر تواضع کرنی پڑتی ہے۔ عام طور پر نمازِ جنازہ میں بھی لوگ ایک دینی فریضہ سمجھ کر نہیں بلکہ رشتہ داری نبھانے کے لیے جانا ضروری سمجھتے ہیں۔

پیدائش کی رسومات:

پیدائش پر بچے کے ننھیال والوں پر تو لازم ہے کہ وہ نہ صرف بچے کے کپڑے بلکہ ماں باپ اور دادا دادی وغیرہ کے لیے بھی جوڑے لے کر آئیں۔ نومولود اگر بچی ہے تو اس کے لیے کوئی چھوٹا موٹا زیور بھی ضروری ہے۔ بچے کے ختنہ کی بھی باقاعدہ تقریب منائی جاتی ہے۔ اور لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

یہ تمام رسومات پورے معاشرے کے لیے بوجھ ہیں۔ ہر شخص ان کو بادلِ نخواستہ نبھاتا ہے۔ ان رسومات کو ناروا بھی سمجھتا ہے مگر خاندان اور برادری والوں سے کٹ جانے کے خوف سے مجبوراً نبھاتا ہے۔

سورۃ الاعراف آیت نمبر 157 میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

ترجمہ: "۔۔۔۔۔۔جو اتباع کریں گے رسولِ نبی اُمی (ﷺ) کا جسے پائیں گے وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں وہ انہیں نیکی کا حکم دیں گے، تمام برائیوں سے روکیں گے اور ان کے لیے تمام پاک چیزیں حلال کر دیں گے اور حرام کر دیں گے ان پر ناپاک چیزوں کو اور ان سے اتار دیں گے ان کے بوجھ اور طوق جو ان (کی گردنوں) پر پڑے ہوں گے۔ تو جو لوگ آپ (ﷺ) پر ایمان لائیں

گے اور آپ (ﷺ) کی تعظیم کریں گے اور آپ کی مدد کریں گے اور پیروی کریں گے اُس نور کی جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا جائے گا وہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔"

گویا کہ لوگوں کے لیے ان کی زندگی گزارنا آسان بنا دیں گے۔ یہ بوجھ اور طوق وہ بے جا اور خود ساختہ پابندیاں اور رسومات ہیں جو معاشرے کے اندر کسی خاص طبقہ کے مفادات یا نمود و نمائش کی خواہش کی وجہ سے رواج پاتی ہیں اور بعد میں غریب لوگوں کو بھی انہیں نبھانا پڑتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ان کی وجہ سے ایک عام آدمی کی زندگی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں بشارت دی جا رہی ہے کہ جب آخری نبی ﷺ آئیں گے تو وہ انسانیت کی غلط رسومات، خود ساختہ عقائد اور نظام ہائے باطلہ کے بوجھوں سے نجات دلا کر عدل اور قسط کا نظام قائم فرمائیں گے۔

لہٰذا اگر ہم دنیا کی پریشانیوں اور مصائب سے نجات اور اخروی فلاح چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے قریب ترین رہ کر گزارنی ہوگی۔

سیرت کے درج ذیل واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک قبیح رسم کا خود حضور اکرم ﷺ کے ہاتھوں خاتمہ فرمایا۔

حضور اکرم ﷺ نے بعثت سے پہلے اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آزاد کر کے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا قرار دے دیا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ آ کر نبی اکرم ﷺ نے ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کرا دی مگر ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ وہ بار بار آ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کی اجازت طلب فرماتے مگر نبی اکرم ﷺ انہیں روک دیتے۔ اس دوران نبی اکرم ﷺ محسوس فرما رہے تھے کہ اگر زید رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی تو تالیفِ قلب کے لیے خود مجھے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنا پڑے گا لیکن ساتھ ہی آپ ﷺ کو منافقین و مخالفین کی طرف سے منفی پروپیگنڈے کا بھی اندیشہ تھا۔ اسی بناء پر سورۃ الاحزاب کی آیت 37 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىٕهِمْ اِذَا

قَضٰوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا

ترجمہ: "اور (اے نبی ﷺ!) جب آپ کہتے تھے اُس شخص سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا تھا اور آپ نے بھی انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرا اور آپ ﷺ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے وہ بات جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ ﷺ لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ آپؐ اس سے ڈریں۔ پس جب زید رضی اللہ عنہ نے اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تو اسے ہم نے آپ ﷺ کی زوجیت میں دے دیا تاکہ مؤمنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں۔ اور اللہ کا فیصلہ تو پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔"

درج بالا آیت سے ہمیں یہ نصیحت حاصل ہوتی ہے کہ ہمیں بے جا رسوم ورواج کی ڈٹ کر مخالفت کرنی چاہیے۔ اس بارے میں ہمیں یہ خوف نہیں لاحق ہونا چاہیے کہ کوئی کیا کہے گا۔ خاندان یا برادری والے ناراض ہوتے ہوں تو ہوتے رہیں۔ ہم نے تو ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی دیکھنی ہے۔ اسی طرح خیر وبھلائی کے کاموں، دین کی طرف سے مشروع کاموں اور مثلاً شرعی پردہ اور شرعی لباس وغیرہ کو رواج دینے میں بھی ذرہ برابر مداہنت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ پیدائش، نکاح، فوتیدگی اور تدفین سے متعلق مواقع پر ہم نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطابق مسنون رسومات کو اپنائیں اور ہر قسم کی غیر مسنون رسومات سے اجتناب کریں۔ علاوہ ازیں ہمارے آباؤ اجداد نے جن اچھی باتوں کو رواج دیا ہے ان کو ہم اپنائیں اور ہم بھی کوشش کریں کہ اچھی عادتوں اور خوبیوں کو رواج دیں۔ اسی طرح اگر آباؤ اجداد کی طرف سے کوئی غلط اور قبیح رسوم ورواج چلی آ رہی ہیں تو ان کو ختم کرنے کی خود بھی کوشش کریں اور لوگوں کو بھی ان کو ختم کرنے کی تلقین کریں۔ یاد رکھیں اگر آج ہم نے کسی نیکی کو رواج دے دیا تو قیامت تک جو لوگ اس پر عمل کریں تو ان سب کا ثواب ہمیں بھی ملے گا اور اگر کسی برائی کی بنیاد ڈال کر اس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں اس کا وبال ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

کام چوری

کام چوری ہمارے معاشرے میں ایک وبائی مرض کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اگر معاشرے میں زیادہ لوگ مریض ہو جائیں تو مرض کا احساس اور صحت کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ ہمارے معاشرے کا انتہائی کثیر حصہ اس بیماری میں مبتلا ہے اور اس کے ضرر کا احساس بھی تقریباً مٹ چکا ہے۔ بلکہ اب تو صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ جو شخص اپنے حصہ کا کام ذمہ داری، دیانتداری اور مستعدی سے انجام دیتا ہے۔ اسے لوگ پاگل اور بے وقوف کہہ دیتے ہیں۔

کام چوری کی پوری تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ ان کاموں میں جان بوجھ کر اور بلا عذر کوتاہی اور سستی کرنا جو ہمارے ذمہ ہیں۔ ان میں سے بعض کام ایسے ہیں جن کا ہمیں معاوضہ ملتا ہے مثلاً ملازمت اور بعض کام ایسے ہیں جن کی ہم نے اپنی مرضی سے ذمہ داری لی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نکاح کر کے ہم اپنے اور اہل وعیال کے نان نفقہ اور ان کی بہترین تعلیم وتربیت کی ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس بات کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں کہ ہم اس کی بندگی کریں گے۔

ان میں سے کوئی بھی ذمہ داری ادا نہ کر کے ہم گناہگار ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر میں ملازمت کے دوران اپنا کام وقت پر سرانجام نہ دوں، موبائل پر کھیلتا رہوں، چائے پینے اور گپ شپ میں وقت گزار دوں تو میری آمدنی پوری طرح جائز نہیں ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں، میں حرام کما رہا ہوں گا۔ اپنے اہل وعیال کے لیے رزقِ حلال کمانے کی جدوجہد نہیں کرتا یا ان کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ نہیں دیتا تو میں اپنے عہد کی خلاف ورزی کا گناہ مول لیتا ہوں۔

بعض لوگ محض طبعاً کاہل اور کسی جسمانی معذوری کی وجہ سے اپنا کام سرانجام دینے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے مخاطب نہیں ہیں، ہمارے اصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو کام کرنے کی تمام صلاحیت رکھنے کے باوجود ایک تو کام نہیں کرتے اور دوسرے اس کام کی انجام دہی کا پورا پھل سمیٹنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

کام چور آدمی عموماً رزقِ حلال کی خواہش نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا کارآمد حصہ بننے کی خواہش رکھتا ہے۔ کام چور آدمی چند مزید بیماریوں کا بھی شکار ہوتا ہے۔ مثلاً سستی، کاہلی،

بغیر محنت کے مال کمانا اور مال کی محبت۔ جب ہر انسانی صلاحیت مال کمانے میں صرف ہو رہی ہو، وہاں کام چوری آہستہ آہستہ آسان اور مختصر راستے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس پر چل کر آدمی کسی مشقت میں پڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے، اس بات کی فکر کیے بغیر کہ وہ راستہ حلال ہے یا حرام۔

ہماری کام چوری دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسے آسانی اور چالاکی کے ساتھ حاصل کرنے کی ایک سوچی سمجھی تدبیر ہے۔

ہمارے معاشرے میں کام چور افراد اکثر اوقات آپ کو دوستوں سے ادھار مانگتے نظر آئیں گے، یہ لوگ عموماً ادھار واپس نہیں کرتے۔ جب لوگوں کا ان پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے تو پھر یہ لوگ منت سماجت اور خوشامد کر کے مدد مانگتے ہیں۔

ان لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ دین اور دنیا میں ترقی کرنے کے لیے مشقت ضروری ہے۔ اگر ہم دنیا میں آرام و آسائش یا کم از کم لوازماتِ زندگی چاہتے ہیں اور آخرت میں بھی کامیابی چاہتے ہیں تو اس کے لیے محنت تو لازماً کرنی ہی پڑے گی۔

سورۃ النجم آیت نمبر 39 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

ترجمہ: ’’اور یہ کہ انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کی اُس نے سعی کی ہوگی۔‘‘

سورۃ الْاِنْشِقَاق آیت نمبر 06 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ

ترجمہ: "اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جا رہا ہے اپنے رب کی طرف، پھر تو اس سے ملنے والا ہے۔"

سورۃ الاحقاف آیت نمبر 19 میں ارشادِ ربانی ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

ترجمہ: "اور ہر ایک کے لیے درجے (اور مقامات) ہوں گے ان کے اعمال کے اعتبار سے، اور تاکہ وہ پورا پورا دے انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔"

سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْكُوْرًا

ترجمہ: "اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہوا اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو، تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔"

یعنی آخرت میں کامیابی کے لیے محنت تو لازماً کرنی ہی پڑے گی۔ ابدی کامیابی کے لیے تو اٰمَنُوْا کے ساتھ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کی شرط قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا

اور فارسی کی کہاوت ہے:

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

"یعنی ایسی کمال کی محنت کرو تم دنیا والوں کے لیے عزیز بن جاؤ"

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ أَعْظَمَ النَّاسِ حَسْرَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اكْتَسَبَ مَالًا مِنْ غَيْرِ طَاعَةِ اللهِ فَوَرَّثَهُ رَجُلًا أَنْفَقَهُ فِي طَاعَةِ اللهِ فَدَخَلَ بِهِ الْجَنَّةَ، وَ دَخَلَ الْأَوَّلُ النَّارَ۔

(مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: "یقیناً قیامت کے دن سب سے زیادہ پشیمان وہ شخص ہوگا جس نے اللہ کے حکم کی تعمیل کیے بغیر مال کمایا، پھر ایک دوسرا شخص اس کے مال کا وارث بنا اور وہ اسے اللہ کی اطاعت میں خرچ کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے جنت میں داخل ہوتا ہے، جبکہ پہلا شخص اس کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوگا۔"

کام چوری کے علاج کا حقیقتاً ایک ہی طریقہ ہے۔ اگر اس کو اختیار کر لیا جائے تو قوی امید ہے کہ کام چوری سے مکمل نجات مل سکتی ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ حلال آمدنی پر اکتفاء اور حرام کمائی سے اجتناب کے تصور کو دل میں راسخ کر لیا جائے اور کسی بھی قیمت پر اس تصور کی خلاف ورزی نہ کیا جائے۔ مثلاً ان وعیدوں کو ہر وقت سامنے رکھا جائے جو حرام کمائی کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں جیسے حرام کھانے والا دوزخ کا ایندھن بنتا ہے۔ اس کی دعا قبول نہیں ہوتی بلکہ نماز، صدقہ، حج غرض کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔

اگر آدمی یہ طے کرلے کہ اسے، حرام تو دور کی بات ہے، مشتبہ رزق سے بھی بچنا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کام چوری کی لعنت میں گرفتار ہوسکے۔

کام چوری دراصل سستی اور محنت سے جی چرانے کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے درج ذیل تدابیر کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔

1- نیک اور چُست لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔ سورۃ التوبہ آیت نمبر 119 میں اللہ تعالیٰ نے سستی دور کرنے کے لیے نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی تلقین کی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ

ترجمہ: "اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرو۔"

2- تہجد کی نماز کی عادت ڈالیں اور صبح فجر سے پہلے اٹھ کر تہجد ادا کرنے کی کوشش جاری رکھیں خواہ صرف دو رکعت ہی ہوں اور مختصر ہوں۔ اور اس کے بعد حلال رزق کے لیے درج ذیل مسنون دعا ضرور پڑھیں۔

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

ترجمہ: "اے اللہ مجھے کفایت دے اپنا حلال رزق دے کر حرام رزق سے بچا اور مجھے اپنے فضل کے ساتھ اپنے سوا دوسروں سے بے نیاز کردے۔" (خزینۂ رحمت، ص48)

3- طرز زندگی میں سادگی بلکہ مشقت اختیار کرنا۔

4- گھر میں اپنے تمام کام خود کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے کپڑے کسی دوسرے سے استری کرانے کے بجائے خود استری کریں۔ اپنے جوتے خود پالش کریں۔ صبح اٹھ کر اپنا بستر خود تہہ کردیں۔ اسی طرح کبھی کبھار گھر کے کاموں میں گھر والوں کی بھی مدد کریں۔ گھر میں چھوٹے موٹے مرمت کے کام خود کرلیں۔

5- دوستوں اور محلے داروں کے کاموں میں ان کی مدد کردیں۔

6- مسجد میں باجماعت تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوشش کریں بالخصوص فجر کی نماز۔

7- حضور اکرم ﷺ سے مردی سستی دور کرنے کے لیے درج ذیل دعاؤں کا زیادہ سے زیادہ ورد کرنا بھی ان شاءاللہ بہت مؤثر ہوگا۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ، وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ

"یا اللہ میں فکر اور غم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور عاجزی اور سستی سے آپ کی پناہ مانگتاں ہوں اور بزدلی اور بخل سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور قرض کے غالب آجانے اور لوگوں کے مسلط ہوجانے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔" (ابوداؤد)

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا طَيِّبًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا

ترجمہ: ''اے اللہ! بے شک میں تجھ سے نفع دینے والے علم کا سوال کرتا ہوں اور پاکیزہ رزق کا اور ایسے عمل کا جو قبول کرلیا جائے۔''

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ، وَأَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔

ترجمہ: ''اے اللہ جن اشیاء کو تو نے حرام کیا، ان سے بچاتے ہوئے اپنی حلال کردہ اشیاء کو میرے لیے کافی کردے اور اپنے فضل سے مجھے اپنے سوا ہر کسی سے بے نیاز کردے۔'' (ترمذی)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں رزقِ حلال کمانے اور حرام کمائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

بطر اور دکھاوا

سورۃ الانفال آیت نمبر 47 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ

ترجمہ: "اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے لوگوں کو دکھانے کے لیے، اور وہ اللہ کے راستے سے روک رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ لوگ کر رہے تھے اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔"

اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ "بطر" اور "ریا"۔ ان دونوں کے معنی دکھاوا یا اترانا ہی ہیں۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ریاکاری ہر چیز میں کی جا سکتی ہے۔ یعنی عبادت میں یا کسی صلاحیت میں یا کسی اور چیز میں۔ جبکہ بطر صرف مال و دولت اور شان و شوکت کے ساتھ مخصوص ہے۔ سورۃ القصص کی آیت نمبر 58 میں فرمایا گیا:

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ

ترجمہ: "اور کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو کہ اتراتی تھیں اپنی معیشت پر۔ تو (دیکھ لو!) یہ ہیں ان کے (کھنڈر بنے ہوئے) گھر نہیں ہوئے ان میں رہنے والے ان کے بعد مگر بہت تھوڑے۔ اور ہم ہی (ان کے) وارث ہو کر رہے۔"

"بطر" زیادہ سے زیادہ ساز و سامان جمع کرنے کی بے لگام خواہش کا نام ہے۔ جن لوگوں میں "بطر" ہوتا ہے، ان کی زندگی کا مقصد ہی محض دولت کمانا اور دولت کو خرچ کرنا رہ جاتا ہے۔ دولت سے جو چیزیں وہ حاصل کرتے ہیں، ان سے انہیں بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ کھانے پینے پر جو پیسے لٹاتے ہیں اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ معیارِ زندگی کو بڑھانے کے لیے تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو پیسہ کمانے اور خرچ کرنے کا چسکا لگ جاتا ہے۔ ان چیزوں کا مشاہدہ ہم اشتہارات اور Bill Boards میں بھی کر سکتے ہیں اور شادی بیاہ، مہندی اور مایوں کی تقریبات میں کر سکتے ہیں کہ منہ کھلے ہوئے ہیں، مصنوعی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے، چہرے پر مسرت ہے۔ اشتہارات میں انسانی جذبات کو برانگیختہ کیا جاتا ہے۔ کوئی آئس کریم کھا کر، کوئی چہرے پر کریم لگا کر، کوئی کار خرید کر دیوانہ ہوا جا رہا

ہے۔ کوئی نرم گدوں کے خواب دیکھ رہا ہے۔ کوئی عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں کے سپنوں میں گم ہے۔ جس کے پاس یہ سب کچھ ہے وہ انہی کی باتیں کر رہا ہے۔ جس کے پاس نہیں ہے وہ انہی کے خواب دیکھ رہا ہے اور اگر کسی کو ان میں سے کوئی حقیر سی چیز بھی مل جائے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی کسی موقع پر چار آدمی جمع ہو جائیں تو پلاٹوں، زمین کی خرید و فروخت یا کھانے پینے کی دکانوں اور فوڈ سٹریٹ کی باتیں ہوتی ہیں اور اگر کہیں چار عورتیں جمع ہو جائیں تو وہ کپڑوں کے فیشن، برانڈ اور جیولری وغیرہ کی باتیں کرتی ہیں۔

کچھ لوگوں کے اندر یہ مال و دولت کا اظہار ایک بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب یہ لوگ اپنے ذرائع آمدنی میں ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتے تو سود پر قرض لے کر سامان آسائش خریدتے ہیں۔ یا قسطوں پر حاصل کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی سود اور قسط ادا کرتے گزر جاتی ہے۔ ڈیپریشن کا شکار رہتے ہیں۔ انہی لوگوں کی وجہ سے کریڈٹ کارڈ اور برانڈڈ اشیاء کا کلچر وجود میں آیا ہے۔ تنخواہ کم ہے حیثیت نہیں ہے مگر کریڈٹ کارڈ پر فرنیچر یا گاڑی خرید لیتے ہیں اور پھر روتا روتے ہیں کہ گزارا نہیں ہو رہا۔ "اترانا" اور "دکھاوا" ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ "اترانا" یعنی "بطر" دل کی ایک بیماری ہے جس کا اظہار دکھاوے اور اترانے میں ہوتا ہے۔

دکھاوے اور اترانے کا لازمی نتیجہ خوشی منانے میں اسراف سے ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو شادی بیاہ کی تقریبات دیکھ لیں۔ شادی کے کارڈ کی اب تو پوری پوری کتابیں چھپنے لگی ہیں۔ مخمل گوٹے کناری اور ربن لگے ہوئے ہوں گے۔ اس کتاب میں مہندی، مایوں، بارات اور ولیمے کے الگ الگ کارڈ موجود ہوتے ہیں۔ حالانکہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان کا ولیمہ کب اور کہاں منعقد گا۔ لوگ صرف تاریخ و مقام پڑھ کر اتنے قیمتی کارڈ کو ڈسٹ بن میں پھینک دیتے ہیں۔ یہی اطلاع واٹس ایپ (WhatsApp) پر ایک میسیج کے ذریعے بھی دی جا سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② (التکاثر: 1 تا 2)

ترجمہ: "غافل کر رکھا ہے تمہیں اس تکاثر کی دوڑ نے یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں۔"

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو بھی "اترانے" سے بچنے کی تربیت دیں۔ باوجود اس کے کہ ہم اپنے

بچوں کو قیمتی سے قیمتی کھلونے لے کر دے سکتے ہیں، مت لے کر دیں۔ ان کے لیے درمیانے درجے کی اسٹیشنری، بستے، کھلونے اور کپڑے وغیرہ خریدیں۔

سورۃ لقمان آیت نمبر 18 میں اللہ تعالیٰ نے حکیم لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت درج ذیل الفاظ میں نقل کی ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ

ترجمہ: "اور اپنے گالوں کو لوگوں کے لیے پھلا کر مت رکھنا اور زمین پہ اکڑ کر مت چلنا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شیخی خورے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔"

معاشرے میں اب تو لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ نہ صرف خود اتراتے اور دکھاوا کرتے ہیں بلکہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ بھی اترانے اور دکھاوے میں ہمارے ساتھ شریک ہوں۔ جو مہمان ہماری دعوت میں شریک ہوں وہ بھی ہمارے ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ شادی بیاہ میں تھیم (Theme) کا رواج چل پڑا ہے۔ مہندی ہے تو سب ہرا جوڑا پہن کر آئیں۔۔ مایوں ہے تو سب زرد۔ نکاح اور ولیمے پر سب کے فلاں ڈیزائن اور فلاں رنگ کے کپڑے ہونے چاہییں۔ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ غریب رشتہ دار اور احباب شادی میں شریک ہو ہی نہیں سکتے۔ بلکہ صحیح معنوں میں یہ سب کچھ کیا ہی اس لیے جاتا ہے تاکہ پتہ چلے کہ ہمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے لوگ بھی ہماری ہی طرح امیر کبیر ہیں۔ دکھاوے کی وجہ سے معیار زندگی (Living Standard) تو بلند ہو جاتا ہے لیکن Quality of Life نہیں رہتی۔ ہر شخص ڈپریشن کا شکار رہتا ہے۔ زندگی سے چین اور سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ ایک بھیڑ چال Rate Race شروع ہو جاتی ہے اور قناعت ختم ہو جاتی ہے۔

سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 124 میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ کو اس طرح بھول کر مادہ پرستی میں مشغول ہو جائیں گے تو کیا ہوگا؟

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ

ترجمہ: "اور جس نے میری یاد سے اعراض کیا تو یقیناً اس کے لیے ہوگی (دنیا کی) زندگی بہت تنگی والی اور ہم اٹھائیں گے اسے قیامت کے دن اندھا (کر کے)۔"

انسان جتنا زیادہ دکھاوا کرتا ہے اور اپنے مال و اسباب پر اتراتا ہے، اتنی ہی زیادہ بے چینی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ گھر تو بہت خوبصورت ہوتا ہے مگر خاندانی نظام مضبوط نہیں ہوتا۔ طلاقیں بڑھ جاتی ہیں۔ انسان تنہا رہ جاتا ہے۔ اولاد نافرمان اور گمراہ ہو جاتی ہے۔ مکان تو شاندار ہوتے ہیں لیکن وہ گھر نہیں رہتے جہاں ہر طرف محبتیں اور رشتوں کا تقدس ہو۔ جب لوگ جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں خرچ نہیں کرتے اور صرف دکھاوے میں خرچ کرتے ہیں تو ایک طرح نقلی معیشت Bubble Economy پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک دم سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

دکھاوے اور بطر کا علاج کیا ہے۔ سب سے پہلے تو بندہ پورے شعور اور ادراک کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے وہ دعا کرے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِي بِمَا رَزَقْتَنِي وَبَارِكْ لِي فِيهِ وَاخْلُفْ عَلَى كُلِّ غَائِبَةٍ لِي بِخَيْرٍ

(حاکم: 51/1، الادب المفرد: 681)

"اے اللہ جو رزق آپ ہمیں نوازیں اس میں ہمیں قانع بنا اور اس میں ہمیں برکت عطا فرما اور ہمارے غائب پر (اہل و عیال) میں بھلائی کے بارے میں نائب بن جا۔"

کسی کا عمدہ مکان، بہترین گاڑی، اعلیٰ اور قیمتی لباس اور ہیرے جواہرات دیکھ کر مرعوب مت ہوں۔ سرسری سی تعریف کر دیں اور دل میں ان چیزوں کی تمنا ہی پیدا نہ ہونے دیں۔ فوراً جنت کا تصور کریں کہ جنت کی نعمتوں کے مقابلے میں ان سب چیزوں کی وقعت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس دوڑ میں مت شامل ہوں کہ ہر اچھی چیز میرے پاس بھی ہو۔ خریداری صرف ضرورت کے تحت کریں، صرف نفس کو تسکین دینے کے لیے نہیں۔ بڑی بڑی سپر مارکیٹوں اور مالز Malls میں جا کر خریداری کرنے کی بجائے معمولی اور چھوٹی دکانوں سے ضرورت کی چیزیں خریدیں۔ بہتر ہے گھر سے خریداری کی ایک فہرست بنا کر نکلیں کہ گھر میں ان ان اشیاء کی ضرورت ہے اور بازار سے اپنی فہرست کے مطابق خریداری کر کے گھر واپس آ جائیں۔

اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہم عام طور پر بازار کیوں جاتے ہیں؟ محض بازاروں میں گھومنے کے لیے؟ Window Shopping کے لیے؟ یا محض سیر کرنے اور دل بہلانے کے لیے؟ اگر ان وجوہات سے ہم بازار جاتے ہیں تو سمجھ لیں کہ یہ "بطر" کی علامت ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت نوازا ہے، ضرورت کی ہر چیز ہمیں مہیا ہے تب بھی ہمیں چاہیے کہ ہم عاجزی اور انکساری اختیار کریں۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جس نے ہمیں اتنا نوازا ہے۔ کسرِ نفسی کے ساتھ ان نعمتوں کو استعمال کریں اور دوسروں کو بھی ان میں شریک کریں اور یہ مستحضر رہے کہ ان تمام نعمتوں کا حساب بھی دینا ہے اور دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ! تو میرا آسان حساب لے اور اے اللہ! ان چیزوں کی محبت میرے دل میں پیدا نہ ہو، میں اپنی وقعت، اپنا معیار اس مادی چیز کے ساتھ نہ بناؤں۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نظر میں اچھا ہوں، اللہ کا اچھا بندہ ہوں تو ہر جگہ اچھا ہوں۔ چاہے تمام نعمتیں نہ ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم پورے شعور کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کریں۔ قرآن کا علم سب سے بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی تو ساری دنیا سے بہتر ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

سورۃ یونس آیت نمبر 58 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ

ترجمہ: "(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔"

ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے:

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت دی اور وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر رشک کرے تو اس نے قرآن کی قدر نہ کی۔"

(بحوالہ: دنیا کی عظیم ترین نعمت قرآن حکیم، خطاب ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

اگر خوشی کا اظہار کرنا ہی ہے تو قرآن کی نعمت پر خوشی کا اظہار کریں۔ دنیادی نعمتوں پر خوشیاں منانا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ قرآن کا علم حاصل ہونے پر خوشیاں مناؤ، یہ اللہ کو پسند ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دکھاوے اور بطر کے مرض سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب کو قناعت کرنے والا بنا دے۔

زبان کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتیں عطا کی ہیں اور یہ تمام صلاحیتیں اس لیے عطا کی گئی ہیں تاکہ وہ دنیا میں اللہ کا خلیفہ بن کر زندگی گزارے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں وہاں پر کھپائے جہاں انہیں کھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا ترغیب دلائی گئی ہے۔ اور آخرت میں اسے ان صلاحیتوں کے حوالے سے جوابدہ بھی ہونا پڑے گا۔ جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 36 میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا

ترجمہ: "(اور مت پیچھے پڑو اُس چیز کے جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں۔ یقیناً سماعت، بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔)"

انہی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت نطق کی بھی ہے۔ یعنی زبان کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی قدرت۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کو ان کی ضرورت کے مطابق ان کو زندگی گزارنے کے لیے درکار صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ مگر بیان کرنے کی صلاحیت ایسی منفرد صلاحیت ہے کہ یہ صرف انسان کو ہی عطا کی گئی ہے یہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن آیات 1 تا 4 میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ ﴿١﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿٢﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿٣﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿٤﴾

ترجمہ: "(وہ رحمٰن ہی ہے۔ جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اس نے اسے بات کو واضح کرنا سکھایا۔)"

درج بالا آیات کا مطلب یہ ہے کہ

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور قرآن حکیم اس کے لیے بہترین نعمت ہے اور بہترین صلاحیت نطق یعنی زبان کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس بولنے کی صلاحیت کو قرآن مجید کی تعلیمات کو سیکھنے، سکھانے اور عام کرنے کے لیے استعمال کرے۔

اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم زبان کا بے دریغ بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ہم کہاں بول رہے ہیں؟ کیا بول رہے ہیں؟ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ سڑک پر چلتے

ہوئے کسی گاڑی کا بمپر کسی دوسری گاڑی یا موٹر سائیکل سے معمولی سا چھو جائے تو فوراً دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور نیچے اُتر کر گالم گلوچ اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہماری قوم میں تحمل اور برداشت تو گویا بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ ق آیت 18 میں فرماتے ہیں۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ

ترجمہ: "انسان کوئی لفظ زبان سے نہیں نکال پاتا مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے۔ ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار۔"

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق انسان جو لفظ بھی زبان سے نکالتا ہے فوراً لکھ لیا جاتا ہے۔ اور اس لکھنے کا مقصد سوائے اِس کے کیا ہو سکتا ہے کہ روزِ قیامت اس سے اس کے بارے میں جواب طلبی ہو۔ لہٰذا انسان کو اپنی زبان سے ہر لفظ سوچ سمجھ کر نکالنا چاہیے۔

ہم خواہ مخواہ سیاست پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایک فریق ایک سیاستدان کا حامی ہے دوسرا فریق دوسرے سیاست دان کا۔ دونوں فریق بحث کرتے کرتے لڑنے پر اتر آتے ہیں جبکہ وہ دونوں سیاستدان ہی عوام کے ساتھ مخلص نہیں اور عوام الناس کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور ہم ان کے ہاتھوں بے وقوف بن کر اپنی توانائیاں اور اوقات ضائع کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے تعلقات بھی خراب کر بیٹھتے ہیں۔ دوسری طرف ان سیاست دانوں کا حال یہ ہے کہ ایک بھائی ایک جماعت سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا دوسرا بھائی یا بھتیجا کسی دوسری جماعت سے، ماں کا تعلق ایک جماعت سے ہے تو بیٹی کا دوسری سے۔ خواہ کوئی جماعت بھی برسرِ اقتدار آجائے وہ مالی فوائد حاصل کرتے ہی رہتے ہیں اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ لنچ ڈنر اور پارٹیاں آپس میں جاری رہتی ہیں۔ خدارا سوچئے اپنی عاقبت کی فکر کیجیے۔ اپنے اوقات کو ضائع کرنے سے بچایئے۔ زبان سے اگر کوئی کلمہ نکلے تو خیر ہی کا کلمہ ہو بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ذکر آپ کی زبان پر جاری رہے۔ مختصر سا کوئی ورد یاد کر لیں اور ہر وقت اسے پڑھتے رہیں۔

ایک بہو اور ساس میں ہر وقت لڑائی رہتی تھی۔ بہو اور ساس دونوں ہی زبان کی بہت تیز تھیں۔ ایک دن بہو تنگ آ کر ایک بزرگ کے پاس گئی اور ان سے ساس کے کے لیے تعویز مانگا۔ بزرگ نے بہو کی پوری کہانی سنی اور اسے تعویز دے کر کہا کہ جب بھی ساس بولنے لگے تو تم اس تعویز کو سختی سے

دانتوں کے درمیان دبا لینا اور جب تک ساس بولتی رہے، اسے دانتوں میں دبائے رکھنا۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں کی لڑائی ختم ہو گئی۔ بہو بہت خوش ہوئی اور بعد میں جب بھی کوئی اور لڑکی اس سے اپنی ساس کی شکایت کرتی وہ اسے وہی تعویز دے کر اسی طرح ہدایت کرتی کہ اسے دانتوں میں دبائے رکھے۔ وہ تعویز گاؤں میں بہت مشہور ہو گیا۔ تجسس کے مارے کسی نے اس تعویز کو کھولا کہ دیکھیں اس تعویز میں کیا لکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ خالی کاغذ ہے۔ یہ ہے خاموش رہنے کی کرامت۔ اسی وجہ سے پرانی کہاوت مشہور ہے۔

"ایک چپ سو کو ہرا دے   یا ایک چپ سو سکھ"

آیئے دیکھتے ہیں کہ زبان کی حفاظت کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہماری کیا راہنمائی کر رہے ہیں۔

سورۃ الحجرات آیت نمبر 12 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ترجمہ: ''اے اہلِ ایمان! زیادہ گمان کرنے سے بچو بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگا! اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اللہ توبہ کا بہت قبول فرمانے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔'' (الحجرات: 12)

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (الھمزہ: 1)

ترجمہ: "بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چنتا رہتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے۔"

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (القلم: 10 تا 11)

"اور آپ مت مانیے کسی ایسے شخص کی بات جو بہت قسمیں کھانے والا انتہائی گھٹیا ہے۔ رُو در رُو طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔"

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلَا اللَّعَّانِ، وَلَا الْفَاحِشِ، وَلَا الْبَذِيْءِ (ترمذی)

"حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن طعنے دینے والا، لعنت کرنے والا، فحش گفتگو کرنے والا اور بدکلام نہیں ہو سکتا۔"

اب اس حدیث کی روشنی میں آج کے مسلمان کا جائزہ لیں۔ اب تو بات بات پر ہم ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کرتے ہیں لعنت ملامت کر رہے ہوتے ہیں۔ بدکلامی اور فحش گفتگو عام ہے۔

حضرت صفوان بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا۔ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ پھر عرض کیا گیا کیا مؤمن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔
پھر عرض کیا گیا کیا مؤمن جھوٹا ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! (موطا امام مالک)

عَنْ اَبِي مُوْسٰی سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ اَلْمُسْلِمَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ

"حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا اسلام میں کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کی زبان سے اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔" (بخاری)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

مَنْ صَمَتَ نَجَا (ترمذی)

اب دیکھیے حضور اکرم ﷺ نے فرمارہے ہیں کہ جو خاموش رہا وہ کامیاب ہو گیا۔ ظاہر ہے جو شخص زیادہ تر خاموش رہے گا وہ ضرورت کے مطابق ہی مختصر کلام کرے گا۔ وہ ضرور بولنے سے پہلے سوچے گا۔ یہ بات مجھے زبان سے نکالنی چاہیے یا نہیں جیسے کہاوت ہے کہ "پہلے تولو پھر بولو"

آج کے دور میں تو ہماری زبانیں بہت تیز ہو گئی ہیں اور بغیر سوچے سمجھے جگہ بے جگہ چلتی رہتی ہیں۔ سوچیے! کیا دوسرے لوگ ہماری زبان سے محفوظ ہیں۔ کہتے ہیں کہ تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے۔ زبان کا دیا ہوا زخم نہیں بھرتا۔ کسی بھی شخص نے آپ کو طعنہ دیا یا برا بھلا کہا۔ بعد میں وہ شخص آپ سے معافی بھی مانگ لے اور آپ اس کو معاف بھی کر دیں۔ مگر آپ اس کا دیا ہوا طعنہ کبھی بھی نہیں بھول پائیں گے۔ وہ بات کبھی بھی آپ کے دل سے نہیں نکل پائے گی۔ لہٰذا ہمیں خاموش رہنے کی عادت اپنانی چاہیے۔ اگر زبان سے کوئی کلمہ نکلے تو خیر ہی کا ہو۔ وگرنہ خاموش رہیں۔

سستی و کسل مندی

سورۃ العنکبوت آیت 69 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

ترجمہ: "اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ہم لازماً ان کی راہنمائی کریں گے اپنے راستوں کی طرف۔ اور یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

کسل ایسی سستی اور کاہلی کو کہتے ہیں جو بے رغبتی سے پیدا ہو۔ مثال کے طور پر ہم بسا اوقات یہ کہہ دیتے ہیں "یار آج میرا کوئی کام کرنے کو دل نہیں کر رہا" گھر میں کوئی ضروری کام پڑا ہوا ہے اور ہم آرام سے پیر پھیلا کر سو رہے ہیں۔ دفتر سے صرف اس لیے چھٹی کر لیتے ہیں کہ آج ذرا نیند پوری کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ صرف سستی کی وجہ سے نماز جماعت سے رہ جاتی ہے یا تکبیر اولیٰ کی فضیلت حاصل نہیں ہو پاتی۔ یا تنظیم کے کسی پروگرام میں بلا کسی شرعی عذر نہیں گئے۔ یہ تمام سستی کی آفات ہیں۔ کسل کی بھی دو قسمیں ہیں۔ طبعی اور ارادی۔ ارادی کسل خالص نفاق کی علامت ہے۔ شریعت میں اس کسل کو مرض بتایا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے تمام اعمالِ خیر متاثر ہوتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں کسل کا مطلب ہو گا "اللہ کی بندگی میں اس لیے کوتاہی کرنا کہ خود بندگی سے بیزاری محسوس ہو" کسل کی تعریف کی رو سے کسل ایک نہایت خطرناک مرض ہے۔ جس کی طرف فوری توجہ نہ کی جائے تو یہ بہت تیزی سے پھیلتا ہے اور بالآخر عبودیت کی موت پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کو ٹالنے کی شعوری اور ارادی کوشش کرنا اور اگر کسی وجہ یا کسی دباؤ کی وجہ تعمیل کرنی پڑ ہی جائے تو بیزاری، بےدلی، بےدھیانی اور بےسلیقگی سے عمل کرنا۔ اس ارادی کسل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے اللہ، رسول اللہ ﷺ اور پورے دین سے ایک گہری اور شدید لاتعلقی پیدا جاتی ہے۔

ارادی کسل کا مرض اکثر اوقات کسی جسمانی یا نفسیاتی وجہ سے نمودار ہوتا ہے۔ اس کا نقصان بھی صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو ذہنی اور جسمانی طور پر عمل کی قوت رکھنے کے باوجود دینی احکام کی بجا آوری میں کسمساتے ہیں۔

اگر کسل صرف دینی اعمال سے مخصوص ہو، شعوری ہو اور ارادے کے ساتھ ہو تو ظاہر ہے کہ یہ ایک

طرح سے دین کا (باطنی طور پر) صریح انکار ہے۔ اس میں مبتلا آدمی اس وقت تک صحت یاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا مسلمان ہونا دل سے قبول نہ کرلے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ کسل کی یہ قسم عام مسلمانوں کے اندر تقریباً ناپید ہے۔ یہ صرف منافقوں کے حصہ میں آئی لیکن محدود ہونے کے باوجود چونکہ نفاق آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے، لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم طرح ہمیں بھی اس خطرے سے غافل نہیں رہنا چاہیے اور اس کی ابتدائی علامات کو بھی سنجیدگی سے لینا چاہئے۔ جو اپنی انتہائی صورت میں منافقوں کا خاصہ ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ نفاق کا وقوع ایک اور چیز ہے اور نفاق کا امکان دوسری چیز ہے۔ مرضِ نفاق کے حملے کا اصل خوف مومن ہی کو لاحق ہوتا ہے، منافق اس سے اندیشہ محسوس نہیں کرتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ)) (بخاری)

''اس مرضِ نفاق سے صرف مؤمن ہی اندیشہ محسوس کرتا ہے اور اس سے خود کو محفوظ و مامون صرف منافق ہی سمجھتا ہے۔''

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ خود اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ عجیب کیفیت میں نَافَقَ حَنْظَلَه، نَافَقَ حَنْظَلَه کہتے ہوئے گھر سے نکلے کہ حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حنظلہ تو منافق ہوگیا، راستے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی انہوں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں تو منافق ہوگیا ہوں۔ اس لیے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں ہوتا ہوں تو ایمان کے اعتبار سے میری کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ اور جب اپنے گھر والوں میں جا کر دنیا کے مشاغل میں مصروف ہوتا ہوں تو میرے دل کی وہ کیفیت برقرار نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ کیفیت تو میری بھی ہوتی ہے تو آؤ چلو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے حنظلہ رضی اللہ عنہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جو کیفیت میری صحبت میں تمہیں حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ مستقل ہوجائے اور تم ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہو تو فرشتے تم سے تمہارے راستوں اور تمہارے بستروں میں مصافحہ کرنے لگیں۔ لیکن اے حنظلہ! یہ دولت تو کبھی کبھار ہی میسر ہوسکتی ہے۔ یعنی کیفیت کا یہ اتار چڑھاؤ فطری ہے۔'' (صحیح مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ تو منافق کی نماز ہے کہ بے پروائی سے بیٹھا آفتاب کو دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ زرد ہوگیا اور اس کے غروب کا وقت قریب

آ گیا تو نماز کو کھڑا ہوا اور چڑیا کی طرح چار چونچیں مار کے ختم کردی اور اللہ کا ذکر بھی اس میں بہت تھوڑا کیا۔ (سنن نسائی)

گویا کہ جو کوئی بھی نماز پڑھنے میں سستی کرتا ہے وہ منافقوں والی نماز پڑھتا ہے۔ اللہ اکبر! سستی کتنا بڑا عیب ہے کہ اس کی وجہ سے منافقوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجائے۔ بہر حال نفاق سے جس درجہ ہم مسلمان اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معاملہ نہیں تھا، بلکہ وہ اس حوالے سے فکر مند رہتے تھے۔ اگر مرضِ نفاق کی ہولناکی اور ہلاکت خیزی ہم پر واضح ہوجائے تو ہماری سستی اور کسل کی کیفیت ختم ہوجائے گی۔ اور ہم دین پر عمل کرنے کے معاملے میں مستعد ہوجائیں گے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ ہر وہ شخص جہاد کے لیے نکلے جو استطاعت رکھتا ہو، حضرت کعب بن مالک، حضرت ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم صرف سستی کی وجہ سے جہاد کے لیے نہیں نکل پائے۔ ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ مسلمان ان کا معاشرتی بائیکاٹ کریں۔

چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت 118 میں ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

''اور ان تین پر بھی (اللہ نے رحمت کی نگاہ کی) جن کا معاملہ مؤخر کردیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود ان پر تنگ پڑگئی اور ان پر اپنی جانیں بھی بوجھ بن گئیں اور انہیں یقین ہوگیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ ہے ہی نہیں۔ تو اُس نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ بھی پھر متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا' بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

چنانچہ معلوم ہوا کہ سستی کوئی معمولی رذیلہ نہیں بلکہ اس کی وجہ سے تو صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بھی مشکل کا شکار ہوگئے تھے۔ کجا یہ کہ ہم جیسے کمزور ایمان والے لوگ۔ ہمیں تو اپنے ایمان کی بہت زیادہ فکر کرنی چاہئے۔

سورۃ التوبہ آیت 119 میں اس بیماری یعنی ''کسل'' کا علاج بھی بتایا گیا ہے۔ فرمایا گیا: ''اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔''

یعنی سُستی سے بچنے کے لیے ہمیں نیک لوگوں کی صُحبت اختیار کرنی چاہیے۔

علاوہ ازیں سُستی کی عادت کے دنیاوی زندگی میں بھی بے پناہ نقصانات ہیں۔ ایک طالب علم صرف سستی کی وجہ سے تعلیم میں اپنی اچھی کارکردگی نہیں دکھا سکتا، اچھی ملازمت نہیں حاصل کرسکتا، دفتر

کے ایک ملازم کی ترقی نہیں ہوسکتی، کاروبار بھی محنت مانگتا ہے۔ انسان کے لیے روزانہ مناسب ورزش یا پیدل چلنا صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ سُستی کی وجہ سے انسان اپنی صحت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا دین و دنیا میں پیش رفت اور آگے بڑھنے کے لیے سستی کا دور کرنا بہت ضروری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہوا کسل ایک انتہائی موذی بیماری ہے اور اس کا فوری علاج بہت ضروری ہے، کسل کے معالجے میں درج ذیل تدابیر ان شاء اللہ بہت مفید ثابت ہوں گی:

1۔ تہجد کی نماز، خواہ عشاء کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کسل کو دور کرنے کا قرآنی نسخہ ہے۔

2۔ ایسی مشغولیت اختیار کرنا جس میں ثواب بھی ہو اور جسمانی مشقت بھی۔ مثلاً لوگوں کے کام کر دینا۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا خصوصاً فجر کی نماز۔

3۔ زبان کو ذکر میں مشغول رکھنے کی کوشش کرنا۔ جس کی زبان ذکر سے تر رہتی ہو وہ کسل مندی کا شکار نہیں ہوسکتا۔

4۔ روزمرہ زندگی میں سادگی بلکہ مشقت اختیار کرنا۔

5۔ اپنے گھر کے کام خود کرنے کی کوشش کرنا۔ بلکہ دوستوں اور محلے داروں کے کاموں میں بھی ان کی مدد کر دینا۔

6۔ سخت تھکن میں کم از کم دو رکعت نفل پڑھ لینا۔

7۔ نیک لوگوں اور بزرگوں کی صحبت میں زیادہ وقت گزارنا۔

8۔ نبی اکرم ﷺ نے درج ذیل دعا تعلیم فرمائی ہے۔ اس دعا کا زیادہ سے زیادہ ورد کرنا بھی ان شاء اللہ مؤثر ہوگا۔

((اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ))

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر وغم سے، عاجزی سے اور کاہلی سے اور بخل سے اور قرض کے غلبہ سے اور لوگوں کے قہر و ظلم و زیادتی سے۔'' آمین یا رب العالمین

اعراض عن اللغو

"لغو" کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں، بلکہ ہر وہ کام مراد ہے جو فی نفسہ مباح ہو، شریعت میں اس کی ممانعت نہ ہو، لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور اس کا راس المال ہے۔ اس "وقت" ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس "وقت" ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا انسان کو اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو یا اس کے ذریعہ سے انسان آخرت کے لیے کمائی کر رہا ہو۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ ہی اس کے ذریعہ آخرت کے لیے کمائی ہو رہی ہو تو اسے "لغو" کہا جائے گا۔ خواہ وہ حرام یا گناہ کا کام نہ بھی ہو۔

سورۃ المومنون کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کامیاب ہونے والے مومنین کی صفات بیان کی ہیں۔ ان میں دوسرا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ(3)

ترجمہ: "اور وہ لوگ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔"

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "لغو" کا بہت گہرا تعلق ہمارے تصورِ زندگی سے ہے۔ ایک شخص کے نزدیک بس یہ دنیا ہی کی زندگی اصل زندگی ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" یعنی "اے بابر! جتنا عیش کرنا ہے کرلو چونکہ زندگی دوبارہ ملنے والی نہیں۔" اسے آخرت کا کوئی پختہ یقین بھی نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس شخص کا اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہوگا وہ اس کا کوئی نہ کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی مشغلہ Hobby ہو، کوئی تفریح Amusement کا سامان ہو۔ وقت گزاری To Pass Time کے لیے کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ یہ دنیا کی زندگی تو بہت مختصر ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ مجھے آخرت کی زندگی کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے، اسی مختصری زندگی میں کرنا ہے جیسا کہ سورۃ عنکبوت آیت نمبر 64 میں ارشاد ربانی ہے۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

ترجمہ: "اور یہ دنیوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے، اگر یہ جانتے ہوتے۔"

یعنی دنیوی زندگی میں کھیل کود اور تفریح کی لذت عارضی ہے۔ آخرت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے۔

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ جو یہاں بوؤ گے وہی آخرت میں کاٹو گے۔

جب دنیا کی یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی تو دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو جائے گا۔ جس کے دل میں ایمان بالآخرہ اس طرح راسخ ہوگا، وہی اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس کرے گا جب کہ اس شخص کا معاملہ ایسا نہیں ہوسکتا جس کا آخرت پر پختہ یقین نہیں ہے۔ سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے جو زمانہ کی قسم کھائی ہے "وَالْعَصْرِ" اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ یہ زمانہ تیزی سے گزر رہا ہے۔ اس کی قدر کرو۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس کی بڑی عبرتناک مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر آواز لگا رہا ہے۔ "لوگو! رحم کرو اگر میری یہ برف فروخت نہ ہوئی تو میرا سارا راس المال پگھل کر ضائع ہوجائے گا۔" برف کے اس تاجر کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے چونکہ ہر لمحہ کے بعد اس کا راس المال ضائع ہو رہا ہے۔ یا جس طرح کسی فوجی کا جنازہ فوج کی بینڈ کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے نزدیک تر کر رہی ہے۔

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں جہاں "عبادالرحمٰن" کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہاں تو یہ وصف اپنی انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

ترجمہ: "اور جب وہ کسی لغو چیز کے پاس سے گزرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔"

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کا کسی لغو اور بے کار کام کی طرف ارادہ کر کے جانا تو خارج از بحث ہے ہی، اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر بھی ہوجائے، مثلاً راہ چلتے دیکھیں کہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا ہے یا کوئی

ناچ گانا ہو رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مومن کو اپنے وقت کی بہت قدر ہوتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں یہ جو محدود سا وقت اور محدود سی فرصت حاصل ہے، اسی کو کارآمد بنا کر اس کے نتائج آخرت کی لامحدود زندگی میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا کہ اسے بے کار کاموں میں صرف کریں۔

آج ہمارے معاشرے میں سب سے سستی اور بے قیمت اگر کوئی چیز ہے تو وہ وقت ہے۔ اسکی قدر و قیمت کا ہمیں احساس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کے لمحات کی قدر نہ کرنے سے عمروں کو ضائع کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہوگیا ہے۔ ہم لوگ بیٹھکوں، ہوٹلوں، فارم ہاؤسوں اور نجی مجلسوں میں، کرکٹ میچ دیکھنے میں کئی کئی گھنٹے اور دن ضائع کرتے ہیں۔ ہمارا کتنا ہی وقت نکتہ چینی، غیبت، بہتان طرازی میں ضائع ہوجاتا ہے۔

"نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں" پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے قبل غنیمت سمجھو، زندگی کو موت سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، مال داری کو فقر سے پہلے اور جوانی کو بڑھاپے سے پہلے۔ (صحیح الترغیب البانی عن عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم)

اس حدیث پاک میں ہر صاحب ایمان کے لیے تعلیم ہے۔ انسان کی فہم و دانش کا تقاضا ہے کہ وہ اس فانی دنیا کے فارغ اوقات اور صحت کو لغو کاموں اور لہو و لعب میں نہ گزار دے بلکہ یاد رکھے کہ کل روزِ قیامت اس کے ہر ہر عمل کا حساب ہوگا۔ اسے اپنے ہر قول و فعل کے بارے میں جواب دینا ہے۔ کراماً کاتبین اس کے ہر قول و فعل کو لکھ رہے ہیں۔ قیامت کے دن اس کے اعمال نامے کو تمام لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، الا یہ کہ جس کا پردہ اللہ رکھنا چاہے۔

اس محدود وقت سے جو فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس کو جلد از جلد حاصل کرلیا جائے۔ آج صحت و تندرستی ہے، کل نامعلوم کسی بیماری کا شکار ہونا پڑ جائے۔ آج فراغت ہے، کل نامعلوم کتنی مصروفیت ہوجائے۔ آج جوانی کا سنہرا دور ہے، کل بڑھاپے میں نہ جانے کن احوال سے سابقہ پڑ جائے اور کیا کیا امراض و عوارض لاحق ہوجائیں۔ آج صاحب حیثیت ہیں، کل نجانے ملک کے کیا حالات ہوں۔ اس لیے جو کرنا ہے اسی لمحۂ حاضر میں کرلیا جائے۔ آخرت کے لیے جو کمائی کرنی ہے، ابھی کرلی جائے۔ جو فائدہ اٹھانا ہے، ابھی اٹھا لیا جائے۔ ورنہ وقت ایسی دودھاری تلوار ہے کہ اگر ہم نے اسے نہ کاٹا تو یہ ہمیں کاٹ دے گی۔

ایک اور ارشادِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ صحت اور فراغت دو ایسی نعمتیں ہیں کہ جن کے سلسلے

میں بے شمار لوگ خسارے میں رہتے ہیں۔اس لیے آخرت میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ انسان آج ہی اس کی قدر کرلے۔(عن ابن عباس رواہ بخاری)

ہمارے معاشرے میں نوجوان کے قیمتی اوقات کے ضیاع کا ایک بڑا سبب سوشل میڈیا اور موبائل فون ہے۔دن بھر موبائل فون پر لگے رہنا،موقع ملتے ہی ٹی وی اور کمپیوٹر پر بیٹھ کر فضول کاموں میں وقت برباد کرنا عام ہے۔ایسا کر کے وہ نہ صرف اپنا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں بلکہ اپنی صحت بھی اپنے ہاتھوں برباد کررہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ گزرا وقت واپس آتا مگر آنے والا ہر لمحہ اور ہر صبح طلوع ہونے والے سورج کی کرنیں امید کا پیغام ضرور دیتی ہیں کہ اب بھی وقت ہے۔اب بھی وقت ضائع کرنے سے باز آجاؤ۔لہوولعب سے توبہ کرلو۔اب بھی زندگی کی جو چند گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں ان کو کارآمد بنالو،آخرت میں کامیابی تمہاری منتظر ہے۔

میدان حشر میں نیک لوگ اور برے لوگ سب ہی حسرت کررہے ہوں گے کہ دنیا میں وقت کیوں ضائع کیا۔برے لوگ وقت کو برے اور لایعنی کاموں میں ضائع کر کے پچھتا رہے ہوں گے۔مگر نیک لوگ بھی جب معمولی سی نیکی کا بہت بڑا اجر ملتا ہوا دیکھیں گے تو وہ بھی پچھتائیں گے کہ جو وقت لایعنی کاموں میں ضائع ہوا،اس میں مزید نیکیاں کما کر زیادہ اعلیٰ درجات حاصل کیے جاسکتے تھے۔

سورۃ مریم آیت نمبر39 میں ارشاد الٰہی ہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

ترجمہ:"اور(اے نبی ﷺ!)ان کو اُس پچھتاوے کے دن سے خبردار کردیجئے جب ہر بات کا آخری فیصلہ ہوجائے گا جبکہ یہ لوگ(اِس وقت)غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لا رہے۔"

لہوولعب کے نقصانات:

لہوولعب اور لایعنی ولغو کاموں کا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ انسان دینی مزاج سے محروم ہوجاتا ہے۔مزید کچھ نقصانات درج ذیل ہیں۔

1۔غفلت

2۔اسراف

3۔لوگوں کو ایذا پہنچانا

4۔وقت کا ضیاع

5۔جھوٹ،غیبت،بہتان،فحش گوئی وغیرہ

6۔خشیتِ الٰہی اور اتباع رسول کا فقدان

7۔دنیا کی بربادی

8۔لہوولعب کا سب سے بڑا نقصان اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق اس سے آدمی کی آخرت برباد ہوسکتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوسکتا ہے(جامع ترمذی)

لہوولعب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ کوئی مثبت مصروفیت ہے۔اس کا بھی سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان جماعتی زندگی گزارے۔ایسی جماعت جس کا نصب العین دین کی سرفرازی ہو۔اپنا فارغ وقت اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں صرف کرے۔فارغ وقت میں قرآن مجید کو یاد کرنا شروع کردے۔مسنون دعائیں اور اذکار یاد کر کے ان کو پڑھنا شروع کردے۔اسی طرح اپنے محلہ اور پڑوس میں بچوں کو اپنے گھر پر بلا کسی معاوضہ کے پڑھانا شروع کردے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں وقت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

اکتسابِ فضائل

صلہ رحمی

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ زمین وآسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کو پیدا کیا۔ ہر ہر مخلوق کو پیدا کر کے اسے اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ بھی سکھایا، اس نے کس طرح اپنی رہائش کا بندوبست کرنا ہے؟ کہاں سے اپنے رزق کا بندوبست کرنا ہے؟ اپنی حفاظت کیسے کرنی ہے؟ پھر رہائش، رزق اور حفاظت کے لیے جن جن مادی اشیاء کی ضرورت تھی وہ تمام وسائل بھی مہیا کر دیے۔ انہیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی سکھا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بندوبست اس لیے کیا کہ یہ تمام کائنات اور جو کچھ بھی اس میں ہے وہ اس کی تخلیق ہے۔ وہ اپنی تخلیق میں ایک بناؤ، نظم اور سدھار چاہتا ہے۔ وہ بگاڑ کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اگر سطحی طور پر کہیں بگاڑ نظر بھی آتا ہے۔ تو دراصل وہ ایک نئی تعمیر کے لیے ہے" كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ (ہر روز اس کی ایک نئی شان ہوتی ہے۔)

پھر جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 70 میں وارد ہوا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا

ترجمہ: "اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور انہیں خشکی اور سمندر میں سواریاں مہیا کی ہیں۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے اور ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔"

اور اسی فضیلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے دوسری مخلوقات سے زیادہ علم دیا۔ اور ان میں رسولوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انسان کو اختیار دیا کہ چاہے وہ اطاعت گزار بندہ بن کر اس دنیا میں زندگی گزارے، چاہے سرکش بن کر۔ چاہے تو اس دنیا کے بناؤ اور ستھراؤ کی فکر کرے اور اعلیٰ کردار اور اعلیٰ اخلاق اپنائے اور چاہے تو بگاڑ کی روش اختیار کرے اور پست کردار اور پست اخلاق اپنا لے، اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کو اس بات کی سمجھ آجاتی ہے اور وہ اس کے فرماں بردار بندے بننے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو "اولوالالباب" کا خطاب دیتے ہیں۔ سورۃ الرعد آیت 19 میں ارشاد گرامی ہے۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ

"(اے نبی ﷺ!) کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا، وہ حق ہے، بھلا اُس جیسا ہوسکتا ہے جو اندھا ہے؟ یقیناً نصیحت تو عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔"

یعنی سمجھ دار لوگ اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کی فرماں برداری کرتے ہوئے وہ بھی اس دنیا میں بناؤ، نظم اور سدھار کی کوشش کرتے ہیں۔ خود بھی بگاڑ کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور اپنی حدِ استطاعت بگاڑ کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانوں میں یہی بناؤ سنگھار اور سدھار "صلہ رحمی" کہلاتا ہے۔ اور بگاڑ و بدنظمی "قطع رحمی" کہلاتا ہے۔ یہ "صلہ رحمی" نہ صرف انسانوں کے درمیان مطلوب ہے بلکہ از روئے احادیث حیوانات اور نباتات بھی اس میں شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ سورۃ الرعد آیت نمبر 21 میں اولوالالباب کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ

ترجمہ: "اولوالالباب وہ لوگ ہیں جوڑتے ہیں اُس کو جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا۔"

یعنی جوڑنے اور صلہ رحمی کا عمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اللہ رب العالمین کی خشیت حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ قیامت کے دن برے حساب سے ڈرتے ہیں۔ سوء الحساب سے مراد ہے کہ ایک ایک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی گرفت ہو جائے۔ جبکہ اہل ایمان کے ساتھ حساباً یسیراً کا معاملہ ہوگا۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر کیا جائے گا۔ اعمال پر سرسری سی نظر ڈال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔

"اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنَا حِسَابًا يَّسِيْرًا" اے اللہ ہم سے آسان حساب کتاب کا معاملہ فرما

صلہ رحمی کا عمل قریبی رشتہ داروں سے شروع ہو کر تمام انسانیت تک محیط ہے۔ جو ہمارے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ ہماری صلہ رحمی کا مستحق ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ صلہ رحمی کا یہ عمل بے تحاشا صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ صلہ رحمی کرنے کے لیے اپنے اوپر جبر کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے بات شروع کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات خاندانی معاملات میں ہمیں رشتہ داروں کی جلی کٹی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ ان کی باتوں کو صبر کے ساتھ اس طرح برداشت کرنا کہ ان کو ترکی بہ ترکی جواب نہ دیا جائے۔ ان سے میل ملاقات اسی طرح جاری رکھا جائے، ممکن ہی نہیں جب تک یہ سارا عمل خالصتاً اللہ کو راضی رکھنے کی نیت سے نہ ہو۔

سورۃ الرعد آیت نمبر (22) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ

ترجمہ: "اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے، اور نماز قائم کی، اور خرچ کیا اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا تھا پوشیدہ طور پر بھی اور اعلانیہ بھی اور وہ بھلائی سے برائی کو دور کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے دارِ آخرت کی کامیابی ہے۔"

یہ اولوالالباب، یہ سمجھدار لوگ، صلہ رحمی کرنے والے صرف اور صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے صبر کرتے ہیں۔ اور یہ صبر بھی ان کو نماز قائم کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ برائی کو بھلائی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کی ایذا رسانی کے باوجود ان کے اوپر خفیہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جنت کا وعدہ ہے۔

اور جنت میں بھی انتہائی اعلیٰ مقام۔ مزید برآں ان لوگوں پر اللہ کا انعام یہ ہوگا کہ جنت کے اس اعلیٰ درجہ میں ان کے والدین، اولاد اور بیویوں کو بھی داخل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ جنت کے ادنیٰ درجہ میں دخول کی اہلیت رکھتے ہوں۔ سورۃ الرعد آیت نمبر 23 میں فرمانِ الٰہی ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ

ترجمہ: "(آخرت کا گھر) وہ باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے، جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو بھی صالح ہوں گے ان کے آباء، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے، اور ہر دروازے سے جنت کے فرشتے ان کے سامنے حاضر ہوں گے۔"

صلہ رحمی کرنے والے لوگ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں یہ نہیں دیکھتے کہ کس کا سلوک ان کے ساتھ کیسا ہے۔ وہ تو بس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لوگوں کے درمیان محبت بناؤ اور سدھار چاہتے ہیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا (رواہ البخاری)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: وہ آدمی صلہ رحمی کا حق

ادا نہیں کرتا جو (صلہ رحمی کرنے والے اپنے اقربا کے ساتھ) بدلے کے طور پر صلہ رحمی کرتا ہے۔ صلہ رحمی کا حق ادا کرنے والا دراصل وہ ہے جو اس حالت میں صلہ رحمی کرے اور قرابت داروں کا حق ادا کرے جب وہ اس کے ساتھ قطع رحمی اور حق تلفی کا معاملہ کریں۔ ظاہر ہے کہ قطع رحمی اور حق تلفی کرنے والوں کے ساتھ جب جوابی طور پر قطع رحمی کا برتاؤ کیا جائے گا تو یہ بیماری اور گندگی معاشرے میں اور زیادہ بڑھے گی اور اس کے برعکس جب ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے گا تو انسانی فطرت سے امید ہے کہ جلد یا بدیر ان کی اصلاح ہوگی اور معاشرے میں صلہ رحمی کو فروغ حاصل ہوگا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ جو لوگ بناؤ اور سنوار کے بجائے بگاڑ کی روش پر قائم ہوں اور کسی بھی وقت ان کو یہ بات سمجھ آجائے کہ وہ غلط راستے پر ہیں اور درست اور صحیح راستے کی طرف پلٹنا چاہیں اور اپنی گزشتہ روش پر شرمندہ بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہو کر ان کو واپس پلٹنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ ان کے پچھلے تمام برے کاموں کو معاف کر دیتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ سچے دل سے نادم ہوں اور آئندہ اپنی روش درست کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ یہی توبہ کا فلسفہ ہے۔ سورۃ فرقان آیت نمبر 70 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

ترجمہ: "ہاں مگر جو کوئی توبہ کرے، ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔"

البتہ جو لوگ بگاڑ کی روش پر قائم رہیں اور صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی کی روش پر قائم رہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں انہیں موت آجائے تو ان کی سزا جہنم ہے۔ سورۃ الرعد آیت نمبر 25 میں ارشاد گرامی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّار

ترجمہ: "اور (اس کے برعکس) وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو اس کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان (رشتوں) کو جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہوگی اور ان کے لیے برا گھر (جہنم) ہے۔"

گویا صلہ رحمی نہ کرنے والے لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ کی لعنت اور آخرت میں برا ٹھکانا ہے۔

آیئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید ارشادات کی روشنی میں صلہ رحمی کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ (صحیح بخاری)

"حضرت جبیر ابن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"

معلوم ہوا کہ قطع رحمی اللہ کے نزدیک اتنا سخت گناہ ہے کہ اس گناہ کی گندگی کے ساتھ کوئی جنت میں نہ جا سکے گا ہاں جب اس کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے یا اللہ کسی وجہ سے اس کو معاف کر دے تو جا سکے گا۔ جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ ہو، جنت کا دروازہ اس کے لیے بند رہے گا۔

اسی طرح انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ.

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((جو کوئی یہ چاہے کہ اس کے رزق میں کشادگی ہو اور دنیا میں اس کی عمر لمبی ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔))" (متفق علیہ)

اس حدیث سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ بعض نیک اعمال کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی برکتوں سے نوازتا ہے یہ حدیث ہماری رہنمائی کر رہی ہے کہ اہلِ قرابت کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک وہ مبارک عمل ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق میں وسعت اور عمر میں زیادتی اور برکت ہوتی ہے۔ صلہ رحمی کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ آدمی اپنی کمائی سے اہلِ قرابت کی مالی خدمت کرے، دوسرے یہ کہ اپنے وقت اور اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان کے کاموں میں لگائے۔ اس کے صلے میں رزق و مال میں وسعت اور زندگی کی مدت میں اضافہ اور برکت اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے عین مطابق ہے۔

عام تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور خانگی الجھنیں جو زیادہ تر حقوقِ قرابت ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، آدمی کے لیے دلی پریشانی، اندرونی کڑھن اور گھٹن کا باعث بنتی ہیں اور کاروبار، ملازمت

اور صحت ہر چیز کو متاثر کرتی ہیں۔لیکن جو لوگ اہلِ خاندان اور اقارب کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، ان کی زندگی انشراح وطمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے ان کے حالات بہتر رہتے ہیں اور فضلِ خداوندی ان کے شاملِ حال رہتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : إِنَّ الرَّحِمَ شَجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ، فَقَالَ اللّٰهُ : مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ

"رحم (یعنی حق قرابت) مشتق ہے رحمان سے اور اس نسبت سے اللہ نے اس سے فرمایا جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اسے توڑوں گا۔" (صحیح بخاری)

یعنی انسانوں کی باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسم پاک رحمٰن سے اور اس کی صفت رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اسی کا سرچشمہ ہے۔اس خصوصی نسبت ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے گا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا، اس کو اللہ تعالیٰ اپنے سے وابستہ کرلے گا اور اپنا بنالے گا۔اور جو کوئی اس کے برعکس قطع رحمی کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سے کاٹ دے گا اور دور اور بے تعلق کردے گا۔اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کی دین میں کتنی اہمیت ہے اور اس میں کوتاہی کتنا سنگین جرم اور کتنی بڑی کوتاہی ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفیق ہونے کی حیثیت سے ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم رشتہ داروں کے ساتھ معاملات میں ان سے بڑھ کر صلہ رحمی کا مظاہرہ کریں۔کیونکہ ان کے ساتھ ہمارا تعارف بطور ایک تنظیم کے رفیق کے بھی ہے۔ہماری جانب سے صلہ رحمی کے مظاہرہ سے ان پر تنظیم کی اہمیت بھی واضح ہوگی کہ تنظیم کے رفیق ہونے کی وجہ سے ہمارے اندر یہ تبدیلی آئی ہے۔ہمارے اس طرز عمل سے ان تک تنظیم کی خاموش دعوت بھی پہنچے گی۔مزید برآں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہم انہیں پوری دل سوزی، خیر خواہی، غم خواری اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ تنظیم کی فکر سے آگاہ کریں۔انہیں ان کے دینی فرائض یاد دلائیں اور تنظیم میں شمولیت کی دعوت دیں۔لیکن ہماری یہ دعوت بھی تبھی کارگر ہوگی جب ہم ان کے ساتھ معاملات میں صلۂ رحمی کا مظاہرہ کررہے ہوں گے۔

عفو ودرگزر (معافی مانگنا اور معاف کردینا)

اسلام جہاں ایک اجتماعی وفلاحی نظام ہے، وہیں یہ ایک روحانی اور اصلاحی نظام بھی ہے۔اسلام اُن تمام پہلوؤں سے انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔جن میں اس کے دین ودنیا اور آخرت کی بہتری اور بھلائی ہے۔چونکہ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔لہٰذا وہ انسانی معاشرے کے اندر تمام انسانوں کو اجتماعیت میں پرونا چاہتا ہے۔اسی وجہ سے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں زندگی گزارنے کے اعلیٰ اصول سکھائے گئے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دین ودنیا کی بھلائی حاصل کریں۔ان اعلیٰ اصولوں میں سے ایک اصول عفو ودرگزر کی صفت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش بھی ہے۔قرآن مجید میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی شان بیان کی گئی ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (بنی اسرائیل:44)

ترجمہ:"بے شک وہ بہت بردبار اور بخشنے والا ہے۔"

غزوۂ احد کے موقع پر چند صحابہ ؓ کی اجتہادی غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں بدل گئی۔حضور اکرم ﷺ بھی زخمی ہوئے اور ستر صحابہ کرام ؓ شہید ہوگئے۔اتنے بڑے نقصان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران آیت 152 اور آیت 155 میں ان کے لیے
وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ اور وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ کے واشگاف الفاظ میں معافی کا اعلان کردیا۔

عفو کا مفہوم:

عفو کے لفظی معنیٰ ہیں: مٹانا، بچنا، اور فالتو ہونا۔شریعت کی اصطلاح میں عفو سے مراد ہے: کسی کی زیادتی اور برائی کو انتقام کی قدرت کے باوجود معاف کردینا اور انتقام نہ لینا، دوسروں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنا، دوسروں کی غلطیوں کو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود صرف اس لیے معاف کردینا تاکہ رضائے الٰہی حاصل ہوسکے۔

فضیلت واہمیت:

اسلامی اخلاقیات میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔یہ حلم اور تحمل کا ایک عملی مظہر ہے۔اگر ہم ایک دوسرے کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف نہیں کریں گے تو اجتماعی نظام فساد کا شکار ہوجائے گا۔اللہ تعالیٰ

نے اس وصف کو بہت بڑے بڑے اخلاقی اوصاف میں شامل کیا ہے۔اور قرآن کریم میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ جب غصہ کی حالت میں ہو تو معاف کردیا کرو۔

جن خوش خصال اور پاکیزہ صفت بندوں کے لیے جنت آراستہ کی گئی ہے۔سورۃ آل عمران آیت نمبر 134 میں ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

"غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی زیادتی یا قصور کو معاف کردینے والے۔"

غصہ کی حالت میں معاف کردینا انتہائی کشادہ دلی ہے۔معاف کردینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان انتقام نہ لے سکتا ہو تو معاف کردے کیونکہ وہ تو سراسر کمزوری ہے۔معاف کرنا یہ ہے کہ انتقام اور بدلہ لینے کی طاقت ہو اور پھر معاف کردے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (البقرہ:237)

ترجمہ:"اور یہ اگر تم درگزر کرو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

ایک اور جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (الاعراف:199)

"(اے نبی ﷺ!) آپ درگزر کا رویہ اپنایئے اور بھلی بات کا حکم دیتے رہیے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔"

ایک داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں، ان میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ اسے نرم دل، متحمل مزاج اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔اسے اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عام لوگوں کے لیے رحم دل اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہئے۔اسے اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔نہایت ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری اور اشتعال والی عادات دعوت کے کام میں زہر کا درجہ رکھتی ہیں۔اور ان سے کام بنتا نہیں ہے بگڑتا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میری رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی، میں نے آپ سے ہاتھ ملانے میں پہل کی، پھر میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! مجھے سب سے افضل عمل

بتائیے، آپ نے فرمایا: اے عقبہ! جو تم سے قطع تعلق کرے، اس سے تعلق جوڑو، جو تمہیں محروم کرے، اسے عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے، اس سے درگزر کرو، (ایک روایت میں ہے: اس کو معاف کرو)"(مسند احمد:17452)"۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو تم سے تعلق توڑے اس سے تعلق جوڑو اور جو تم سے برا سلوک کرے اس سے اچھا سلوک کرو اور حق بات کہو خواہ وہ تمہارے خلاف ہو، (الجامع الصغیر:7217)"۔

انصاف کے ساتھ ظلم کا بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن فضیلت اور عزیمت یہی ہے کہ بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود محض اللہ کے لیے معاف کردیا جائے۔

قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 40 میں فرمایا گیا۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ:40)

ترجمہ:"اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے (یعنی جس درجے کی زیادتی کسی نے کی، اس کے بدلہ میں اس کے ساتھ اسی درجہ کی زیادتی کی قانونی اجازت ہے۔) لیکن اللہ کا جو بندہ (انتقام نہ لے اور) معاف کردے اور صلح واصلاح کی کوشش کرے تو اس کا اجر وثواب اللہ کے ذمہ ہے"

ویسے تو عفو ودرگزر ایک ایسا اخلاقی وصف ہے جو ہر مومن میں ہونا چاہیے اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں عام طور پر اس کا اظہار ہونا چاہیے۔لیکن ملازمین اور ماتحتوں کے ساتھ عفو ودرگزر کا رویہ خصوصی طور پر پسندیدہ عمل ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا کہ ہم خدمت گاروں کے قصور کتنی مرتبہ معاف کریں آپ ﷺ خاموش رہے۔اس نے اپنی بات کو دہرایا تو بھی آپ ﷺ خاموش رہے۔جب تیسری مرتبہ اس نے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اُعْفُ عَنْهُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً ہر روز ستر مرتبہ معاف کیا کرو (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا، اے پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہیں؟ ارشاد فرمایا: وہ بندے جو (قصوروار پر) قابو پانے کے بعد (اور سزا پر قدرت رکھنے کے باوجود) اس کو معاف کردیں۔(شعب الایمان للبیہقی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنی زبان کو (لوگوں کی پردہ دری سے) روکے رکھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اور جس نے اپنے غصہ پر قابو پایا، اللہ اپنے عذاب کو اس سے روک دے گا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے حضور (اپنی خطاؤں پر) معافی کا طلبگار رہا، اللہ تعالیٰ اس کی معافی قبول فرمائے گا“۔ (شعب الایمان)

آیئے ایک دوسرے پہلو سے بھی عفو و درگزر کے معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ آج کل معافی بھی مشروط ہوتی ہے۔ یعنی کہنے والا کہتا ہے: ”اگر میری بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں“ اس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اپنی بات کی صحت پر اصرار کر رہا ہے۔ ہر سننے والے اور پڑھنے والے کو واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کر رہا بلکہ اُسے مخاطب کے فہم کا قصور قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا اس طور کی معافی کسی صورت میں معافی نہیں ہے۔ معافی اسے کہتے ہیں ”جب انسان اپنی غلطی کا اعتراف کرے، اس پر نادم اور شرمندہ ہو، اس کے لیے کوئی عذر نہ تراشے اور غیر مشروط طور پر معافی مانگ لے۔ اس طور سے معافی مانگنا قابلِ تحسین ہے اور ایسے شخص کی معافی قبول کرنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ امر ہے۔

وکیل بن الجراح کہتے ہیں: سفیان ثوری بیمار پڑ گئے میں نے ان کی عیادت میں تاخیر کر دی، پھر میں ان کی عیادت کو آیا اور تاخیر پر معذرت کی تو انہوں نے کہا۔ بھائی! معذرت نہ کرو، بہت سے معذرت کرنے والے جھوٹ بولتے ہیں۔ جان لو دوست سے کوئی حساب طلبی نہیں ہوتی اور دشمن سے خیر کی توقع نہیں ہوتی۔

ابتدائے آفرینش میں ہمارے سامنے دو مثالیں ہیں: آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل کیا تو اس کی بابت قرآن کریم بیان فرماتا ہے: اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو، کسی روک ٹوک کے بغیر کھاؤ، ہاں! اس (خاص) درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے انہیں اُس درخت کے ذریعے پھسلایا اور اُن نعمتوں سے باہر نکال دیا جن میں وہ رہتے تھے“ پھر آدم و حوا جنت سے نکالے گئے۔ وہ اپنے کیے پر نادم ہوئے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”پھر آدم نے اپنے رب سے (توبہ کے) کلمات سیکھ لیے اور توبہ کی، بے شک وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان ہے“ (البقرہ: 33 تا 37)۔ اُن کلماتِ توبہ کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان دونوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی

جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے“ (الاعراف: 23)۔ الغرض حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے اپنی خطائے اجتہادی کو تسلیم کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے غیر مشروط معافی مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اس کے برعکس شیطان نے بھی آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے از راہِ تکبر و استکبار اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی، تو اللہ تعالیٰ نے اُس سے بھی جواب طلبی فرمائی: جب میں نے تجھے (آدم کو سجدہ کرنے کا) حکم دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا، ابلیس نے کہا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے اور اُسے مٹی سے پیدا کیا ہے“ (الاعراف: 12)۔ الغرض ابلیس نے اپنے جوہرِ تخلیق کو افضل قرار دیتے ہوئے آدم علیہ السلام پر اپنی برتری ثابت کی، منطق اور دلیل کا سہارا لیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلا چون و چرا تسلیم نہ کیا اور قیامت تک کے لیے راندۂ درگاہ اور ملعون قرار پایا۔ پس اپنی خطا کو تسلیم کر کے غیر مشروط طور پر معافی مانگنا آدمیت ہے اور آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کو قصداً تسلیم نہ کر کے اس کا جواز پیش کرنا اور عقلی دلیل کا سہارا لینا یہ ابلیس کا وتیرہ ہے اور اسی بنا پر ہمیشہ کے لیے وہ راندۂ درگاہ ٹھہرا۔

آج کا مسئلہ یہی ہے کہ لوگ اپنی غلطی کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر کے معافی مانگنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا عُجب و استکبار انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ بودے دلائل کا سہارا لے کر اپنے نفسِ امّارہ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ یہی شعار تمام خرابیوں کی جڑ ہے، جبکہ آدمیت عجز و انکسار کا نام ہے۔ غلطی کو تسلیم کر کے اس کا ازالہ کرنا شعارِ آدمیت ہے، افتخارِ آدمیت ہے، وسیلۂ نجات ہے اور اسی سے بغض و عداوت اور نفرتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر سوائے تین افراد (حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ) کے لگ بھگ اَسّی افراد کسی معقول عذر کے بغیر جان بوجھ کر جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے۔ واپسی پر صرف مذکورہ بالا تینوں صحابہ نے واضح طور پر غیر مشروط اپنی غلطی کا اعتراف کیا، شرمندہ ہوئے اور توبہ کی یعنی اپنی غلطی پر معافی مانگی۔ لہٰذا ان تینوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے پچاس روزہ معاشرتی بائیکاٹ کے بعد توبہ قبول بھی ہو گئی۔ جس کا ذکر سورۃ توبہ میں آیت نمبر 118 موجود ہے۔

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

ترجمہ: "اوران تین پر بھی (اللہ نے رحمت کی نگاہ کی) جن کا معاملہ مؤخر کردیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود ان پر تنگ پڑ گئی اور ان پر اپنی جانیں بھی بوجھ بن گئیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ ہے ہی نہیں۔ تو اُس نے ان کی توبہ قبول فرمائی تا کہ وہ بھی پھر متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

باقی تمام منافقین نے صرف بہانے بنائے۔ اور جھوٹی معذرتیں کرتے رہے۔ نہ تو اپنی غلطی تسلیم کی اور نہ ہی معافی مانگی۔

دوسری طرف جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہ کرے حالانکہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہو، اپنی غلطی پر شرمندہ بھی ہو، ایسے شخص کے لیے احادیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت جودان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے اپنے بھائی کے سامنے (اپنی کسی غلطی پر) معافی مانگی اور اس نے یہ معافی قبول نہ کی تو اس پر ایسا ہی گناہ ہوگا جیسے ٹیکس کی وصولی میں خیانت یا زیادتی کرنے والے پر ہوتا ہے" (ابن ماجہ)

ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم پاک دامنی اختیار کرو تا کہ تمہاری عورتیں بھی پاک دامن ہوں۔ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو تا کہ تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اور جو (اپنی کسی غلطی پر) اپنے مسلمان بھائی سے معافی مانگے اور وہ اس کو قبول نہ کرے تو وہ میرے حوضِ (کوثر) پر نہیں آئے گا۔ (المعجم الاوسط)

یہاں یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ قصوروار کا قصور معاف کرنے کی اس فضیلت کا تعلق افراد و اشخاص اور ان کے ذاتی و نجی حقوق و معاملات سے ہے، لیکن جو جرائم اللہ تعالیٰ کے جرائم ہیں اور اللہ کی طرف سے ان پر سزا مقرر ہے، اس سزا کو معاف کر دینے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ جو دنیا میں سب سے زیادہ رحمدل تھے، آپ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ اپنا قصور کرنے والوں کو ہمیشہ معاف کر دیتے تھے۔ لیکن اللہ کی حدود کو پامال کرنے والوں کو اللہ کے حکم کے مطابق ضرور سزا دیتے تھے، صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی کو کوئی سزا نہیں دی۔ لیکن جب اللہ کی حدود کو کوئی توڑتا تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سزا دیتے تھے۔

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے بھی ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کی

تلوار اور عفو و درگزر کی ڈھال سے لوگوں کے دلوں کے مسخر کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی عفو و درگزر کی بہترین مثال ہے۔ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی، آپ نے ان کے لیے دعائیں کیں۔ جنہوں نے آپ ﷺ کو لہولہان کیا، آپ ﷺ نے انہیں دینِ رحمت کی دعوت دی۔ اور جنت کی بشارت ان کے سامنے رکھی۔ فتح مکہ کے بعد جب حضور اکرم ﷺ کا اپنے دشمنوں پر غلبہ ہو گیا اور انتقام لینے کی پوری قدرت حاصل ہو گئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: آج میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ۔ (سورۃ یوسف:92)۔۔ اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))

ترجمہ: "یعنی آج تم پر (کوئی باز پرس نہیں، کوئی مواخذہ نہیں، کوئی سرزنش نہیں) اللہ تمہیں معاف فرمائے۔ وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے" جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رحمت دو عالم ﷺ کے اس کریمانہ سلوک کا قریش مکہ پر یہ اثر ہوا کہ ان کے دل و دماغ سے کفر و شرک کا زنگ آناً فاناً دور ہو گیا۔ وہ اسلام اور داعیٔ اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام کی بیعت کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔

یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ دعوتِ دین اور تبلیغ میں حکمت کے جو چند اصول بیان کیے گئے ہیں۔ عفو و درگزر ان میں سے ایک ہے۔ سخت اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے اور ہر طرح کی ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ نظر انداز کر دینا چاہیے۔ سورۃ آلِ عمران آیت نمبر 159 میں حضور اکرم ﷺ کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں ہدایت دی گئی۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

ترجمہ: "پس آپ ﷺ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے استغفار کی دعا کیجئے اور معاملہ میں ان سے مشورہ کیجئے۔"

یعنی دین کے راستے میں ایک داعیٔ حق کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں کو نہ صرف معاف کر دیا کرے بلکہ ان کے لیے استغفار کی بھی دعا کرے اور ان کی کمزوریوں کے باوجود ان کو مشورے میں شریک بھی رکھے۔

دینی و دنیاوی معاملات میں میانہ روی

کوئی دینی عقیدہ، مسئلہ یا رَوّیہ ہو یا دنیاوی معاملات اور رَوّیے ہوں۔ ان میں دو انتہائیں ہوتی ہیں۔ ایک کو اِفراط کہتے ہیں اور دوسری کو تفریط۔ اِفراط کے معنیٰ ہیں: حد سے تجاوز کرنا، کسی کے مقام کو بیان کرنے میں مبالغہ آمیزی سے کام لینا۔ جبکہ تفریط کے کے معنیٰ ہیں: کمی کرنا، کسی کو اس کے مرتبہ سے گرا دینا۔

عقیدہ میں افراط و تفریط:

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میری شان میں غلو نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی شان میں غلو کیا ہے (یعنی انہیں اللہ کا بیٹا قرار دے دیا) پس میں اللہ کا بندہ ہوں (خدا نہیں ہوں) سو تم یہ کہو: اللہ کے بندے اور اس کے رسول ﷺ (بخاری)

غلو کے معنیٰ ہیں شان بیان کرنے میں حد سے تجاوز کرنا۔ سورۃ النسا آیت نمبر 171 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ

"اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو۔"

اور اس سے بچنے کی تاکید نبی کریم ﷺ مومنوں کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّيْنِ

ترجمہ: "اے لوگو! خبردار غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کرنے ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ انتہا پسندی میں نہ پڑنا۔" (مسند احمد بروایت ابنِ عباس)

حضور اکرم ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے۔

بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ (مسند احمد بروایت ابوامامہ)

"مجھے ایک ایسے موحِّدانہ طرزِ زندگی کے ساتھ بھیجا گیا ہے جس میں آسائش اور رواداری ہے۔"

ایک بار حضور اکرم ﷺ نے اپنی تقریر میں تین بار فرمایا:

هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ ترجمہ: "غلو میں گہرے اترنے والے ہلاک ہو گئے۔" اہلِ کتاب میں سے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفریط سے کام لیا، آپ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ عفیفہ طیبہ طاہرہ سیدہ مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کے بارے میں حد سے تجاوز کیا اور انہیں مقامِ بندگی سے اٹھا کر مقامِ الوہیت تک پہنچا دیا۔ حتیٰ کہ "ابن اللہ" کہا۔ افسوس کہ امتِ محمدیہ میں سے بھی کچھ ناسمجھ لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ افراط و تفریط سے کام لیا۔ مثلاً کسی نعت گو شاعر نے کہا:

مدینہ کی مسجد میں منبر کے اوپر
بغیر عین کے اِک عرب ہم نے دیکھا

"عرب" کے لفظ سے اگر "ع" کو ہٹا دیا جائے تو باقی "رب" بچتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے مستند فرقوں کے مستند عقائد میں کوئی ایسا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ ہی کے بارے میں ایک اور حوالے سے بھی ہمارے ہاں افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ ہے مسئلہ نور و بشر۔ ایک گروہ رسول اللہ کی بشریت کی نفی اور نورانیت کے اثبات پر اور دوسرا گروہ آپ ﷺ کی نورانیت کی نفی اور بشریت کے اثبات پر بہت زیادہ زور لگاتا ہے۔ جب کہ دونوں ہی گروہ افراط تفریط کا شکار ہیں۔ حقیقت میں آپ ﷺ بیک وقت بشر بھی تھے اور نور بھی۔ اور یہ معاملہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی نہیں بلکہ ہر انسان کا ہے۔ ہر انسان کے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک اس کا حیوانی یا مادی وجود ہے۔ دوسرا اس کا نورانی وجود ہے جسے ہم روح کہہ دیتے ہیں بقول علامہ اقبال ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اس خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ ہمارا حیوانی وجود بہت طاقتور اور روحانی وجود بہت کمزور ہے۔ جبکہ حضور اکرم ﷺ کی نورانیت (روحانی وجود) اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور جسمانی وجود کے لحاظ سے بھی بہت طاقتور تھے۔ لہٰذا حضور اکرم ﷺ کی مدح سرائی اور نعت گوئی کرتے ہوئے ہمیں افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

عبادات میں افراط و تفریط:

عبادات میں ہم سب سے پہلے نماز کا جائزہ لیتے ہیں۔ نماز ایک تو انفرادی ہوتی ہے۔ اس میں شریعت

نے طویل قرأت، قیام اور رکوع وسجود کو قابلِ تحسین قرار دیا ہے۔ سورۃ مزّمل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تہائی رات، نصف رات یا دو تہائی رات تک قیام کی مدح فرمائی ہے۔ لہٰذا جب تک طبیعت پر گراں نہ گزرے اور دل سکون وقرار محسوس کرے، انفرادی نماز کو طول دینا ہمیشہ اللہ والوں کا شعار رہا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز میں لوگوں پر گراں گزرنے والی طوالت کو ناپسند فرمایا۔ کیونکہ جماعت میں مختلف عمروں، ہمتوں، احوال اور استعداد کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ان سب کی رعایت لازم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں فجر کی باجماعت نماز چھوڑ دیتا ہوں کیونکہ فلاں امام ہمیں بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ بہت سخت غضب ناک ہوئے۔ میں نے آپ ﷺ کو کسی اور موقع پر اس سے زیادہ غضب میں نہیں دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! تم میں سے بعض لوگوں کو (دین سے) متنفر کرنے والے ہیں۔ پس جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے، وہ اختصار سے کام لے کیونکہ اس کے پیچھے کمزور، بوڑھے اور کام کاج پر جانے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ان کلمات کا اضافہ ہے" اور جب تم میں سے کوئی شخص تنہا اپنی نماز پڑھ رہا ہو تو جس قدر چاہے لمبی نماز پڑھے" (بخاری)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص پانی لانے والی اپنی دو اونٹنیوں کے ساتھ آیا جبکہ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھاتے ہوئے پایا تو اپنی اونٹنیوں کو چھوڑ کر نماز میں شامل ہو گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۃ البقرۃ یا سورۃ النساء کی تلاوت شروع کردی۔ وہ شخص نماز چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے خبر پہنچی کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اس سے ناراض ہوئے ہیں پس وہ شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تو نبی اکرم ﷺ نے تین بار فرمایا: معاذ! تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالتے ہو، تم نے سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الشمس اور سورۃ والیل کیوں نہ پڑھ لی، کیونکہ تمہارے پیچھے بڑی عمر والے، کمزور اور کام پر جانے والے لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ کا مختصر قیام، مختصر رکوع وسجود بھی ہماری نسبت طویل ہوتے تھے۔

ایک اور حدیث میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا

ترجمہ: "لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو اور انہیں مشکل میں نہ ڈالو اور انہیں بشارتیں دو (دین سے) نفرت نہ دلاؤ" (بخاری ومسلم بروایت حضرت انس)

آپ ﷺ نے انفرادی نماز کی طوالت پسندیدہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ تفریط پر بھی وعید فرمائی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں منافق کی نماز کے بارے میں نہ بتاؤں، وہ عصر کی نماز کو مؤخر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے، پھر وہ (جلدی سے) اٹھتا ہے اور مرغے کی طرح ٹھونگیں مارتا ہے (یعنی جلدی جلدی رکوع وسجود کرتا ہے) اللہ کا ذکر بھی بہت کم کرتا ہے (مسند احمد)

خلاصہ یہ کہ باجماعت نماز کو متوازن ہونا چاہیے تاکہ سب لوگوں کے احوال کی رعایت ہو اور انفرادی نماز خشوع وخضوع کی کیفیات کے ساتھ جتنی طویل پڑھ سکتا ہو، پڑھے، یہ پسندیدہ بات ہے،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی اکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اس وقت ان کے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یہ فلاں عورت ہیں، ان کی (خشوع وخضوع پر مبنی) نماز کا بہت چرچا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: رکو! تم اپنی طاقت کے مطابق پابندی سے عبادت کرتی رہو، پس اللہ کی قسم! اللہ تم سے اپنے فضل کو نہیں روکتا جب تک تم عبادت کرتے کرتے اکتا نہ جاؤ اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ عبادت ہے جس پر عبادت کرنے والا ہمیشگی اختیار کرے (بخاری)

یہ حدیث ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ عبادت میں توازن ہونا چاہیے۔ ایک یا چند لمبی نمازیں پڑھ لینا اور پھر نماز کو ترک کر دینے سے بہتر ہے کہ نماز کا نظام الاوقات متوازن ہو لیکن اس میں ہمیشگی ہو۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ وَفِي رِوَايَةٍ: »سَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَاغْدُوا وَرُوحُوا، وَشَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ، الْقَصْدَ الْقَصْدَ تَبْلُغُوا (صحيح رواه البخاري)

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "بے شک دین آسان ہے اور جب بھی دین پر سختی تھوپنے کی کوشش کی جائے گی، تو دین ایسا کرنے والے پر غالب آجائے گا۔ لہٰذا

عمل کے معاملے میں اعتدال سے کام لو، اگر کامل ترین صورت نہیں اپنا سکتے تو ایسے اعمال کرو جو اس سے قریب تر ہوں، اپنے رب کے پاس ملنے والے ثواب کی خوش خبری قبول کرو، اور صبح و شام اور کسی قدر رات کی عبادت کے ذریعے مدد حاصل کرو"۔ ایک اور روایت میں ہے: "عمل کے معاملے میں اعتدال سے کام لو اور اگر کامل ترین صورت اپنا نہیں سکتے تو ایسے اعمال کرو جو اس سے قریب تر ہوں۔ صبح کو چلو، شام کو چلو، اور رات کے کچھ حصے میں، میانہ روی سے کام لو اور اعتدال کا دامن نہ چھوڑو، منزلِ مقصود کو پہنچ جاؤ گے"۔

معیارِ تقویٰ:

دین رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔ اسی طرح تقویٰ بھی وہی پسندیدہ ہے جو شعارِ نبوت کے مطابق ہو۔ من پسند معیارِ تقویٰ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں: تین افراد نبی ﷺ کی عبادت (کے معمولات جاننے کے لیے) ازواجِ مطہرات کے گھروں پر آئے، پس جب انہیں آپ ﷺ کی عبادت کا معمول بتایا گیا تو انہوں نے اپنی دانست میں اسے کم سمجھا اور کہا: کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ۔ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے مغفرتِ کلی کی قطعی سند عطا فرما دی ہے، ان میں سے ایک نے کہا میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی وقفہ نہیں کروں گا، تیسرے نے کہا: میں تجرد کی زندگی گزاروں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ (دریں اثنا) رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں نے اس طرح کی باتیں کی ہیں۔ سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت رکھنے والا اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں۔ لیکن میں کبھی نفلی روزے رکھتا ہوں اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں، میں راتوں کو نوافل پڑھتا ہوں اور کچھ دیر کے لیے سو بھی جاتا ہوں اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کر رکھے ہیں (تو ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں)۔

پھر فرمایا "فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِی فَلَیْسَ مِنِّی"

"پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا، وہ میرے (پسندیدہ) طریقے پر نہیں ہے۔" (بخاری)

روزوں میں میانہ روی:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ ؓ بن عمرو بن عاص سے پوچھا: عبداللہ! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو، میں نے عرض کی: جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ!

آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو کبھی روزے رکھ لیا کرو اور کبھی چھوڑ دیا کرو، رات کو نوافل پڑھا کرو اور کچھ دیر سو بھی جایا کرو۔ کیونکہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے۔ سو تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم ہر مہینے تین روزے رکھ لیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا اجر دس گنا عطا فرماتا ہے۔ اور اس طرح تمہیں صائم الدہر ہونے کا ثواب مل جائے گا۔ میں نے (رسول اللہ ﷺ کے اس مشورے پر عمل نہ کیا اور) اپنے اوپر سختی کی تو میرے لیے بھی سختی مقدر ہو گئی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے اندر قوت پاتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کی طرح روزہ رکھ لیا کرو۔ میں نے عرض کی: داؤد علیہ السلام کا روزوں کی بابت کیا معمول تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ بڑھاپے میں کہتے تھے: کاش کہ میں نے نبی ﷺ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کر لیا ہوتا' (بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی ؓ اور حضرت ابو درداء ؓ میں مؤاخات کا رشتہ قائم فرمایا، وہ ابو درداء ؓ سے ملنے آئے تو دیکھا کہ اُمِّ درداء ؓ پراگندہ حال ہیں، انہوں نے کہا: تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، اُمِ درداء ؓ نے جواب دیا: تمہارے بھائی ابو درداء ؓ کو دنیاوی حاجات سے غرض ہی نہیں (تو میں کس کے لیے زیب و زینت اختیار کروں) اتنے میں ابو درداء ؓ آ گئے تو انہوں نے حضرت سلمان فارسی ؓ کو کھانا پیش کیا، حضرت سلمان ؓ نے کہا: آپ بھی کھائیں، حضرت ابو درداء ؓ نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان ؓ نے کہا: میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ پھر حضرت ابو درداء ؓ نے کھانا کھایا، پھر جب رات ہو گئی تو ابو درداء ؓ نماز پڑھنے کے لیے جانے لگے، حضرت سلمان ؓ نے ان سے کہا: سو جاؤ (مہمان کے اکرام میں) وہ سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر نماز پڑھنے کے لیے اُٹھے حضرت سلمان فارسی ؓ نے پھر کہا: سو جاؤ۔ پھر جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان فارسی ؓ نے کہا: اب آپ اٹھیں، پھر دونوں نے نماز ادا کی۔ پھر ان سے حضرت سلمان فارسی ؓ نے کہا: آپ کے رب کا آپ پر حق ہے، آپ کے نفس کا آپ پر حق ہے۔ آپ کی اہلیہ کا بھی آپ پر حق ہے آپ ہر حقدار کو اس کا حق دیں۔ پھر حضرت ابو درداء ؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس گئے اور آپ ﷺ کو یہ قصہ سنایا تو نبی اکرم ﷺ نے کہا سلمان ؓ نے سچ کہا ہے۔ (بخاری)

راتوں کو عبادت میں قیام کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تعریف فرمائی ہے لیکن

شریعت نے اس میں غلو کو پسند نہیں کیا، شریعت اس بات کو بھی پسند نہیں کرتی کہ بندوں کے حقوق کو نظر انداز کر کے محض عبادت گزاری کو کل دین سمجھ لیا جائے۔ ہمارے اہل وعیال کا بھی ہم پر حق ہے۔ پڑوسیوں کی خبر گیری، بیماروں کی تیمارداری، بیواؤں اور یتیموں کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ کے بندوں کا ہم پر یہ بھی حق ہے کہ ہم دین کے معاملے ان کی رہنمائی کریں۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمان "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ" پر عمل کرتے ہوئے حکمرانوں سے لے کر ایک عام آدمی تک۔ ہمیں ان کو بتانا ہے کہ ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے۔

شہادت علی الناس اور اقامت دین کے لیے جدوجہد بھی ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے۔ لہٰذا یہ تمام کام ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں اور ان تمام کاموں میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے ایک توازن قائم رکھنا بھی دین کا تقاضا ہے۔

مزاج میں بے اعتدالی:

اقامت دین کے لیے کام کرنے والوں کے مزاج میں بھی اعتدال ہونا چاہیے۔ اگر مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہوجائے تو انسان بالعموم ہر چیز کا صرف ایک رخ دیکھتا ہے۔ دوسرا رخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا لحاظ کرتا ہے اور دوسرے پہلو کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ایک سمت میں اس کا ذہن چل پڑتا ہے تو وہ اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسری سمتوں کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اس کو پکڑ لیتا ہے۔ ویسی ہی دوسری اہم چیزیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ جس چیز کو برا سمجھ لیتا ہے، بس اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابل توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو اصول پرستی میں شدت دکھانے لگتا ہے۔ کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملیت پسند بن جاتا ہے اور کامیابی ہی کو مقصود بالذات بنا لیتا ہے۔

یہ کیفیت آگے بڑھ کر سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے میں شدت برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطہ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو اس کے لیے ناقابل برداشت بناتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ جماعت

سے ہی کٹ جاتا ہے۔

اگر کسی جماعت میں ایسے، بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج لوگ جمع ہو جائیں تو پھر جماعت میں مختلف ٹولیاں بن جاتی ہیں۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوجاتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھوٹ پڑتی ہے، دھڑے بندیاں ہوتی ہیں۔ اور اس کشاکش میں وہ کام ہی خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔ جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی سے کچھ لوگ جمع ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ انہیں انجام دینے کے لیے بہرحال بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی سمجھنی ہوتی ہے۔ ایک جماعت میں طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف اور ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے، جس کے بغیر تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ موافقت کے لیے کسر وانکسار ضروری ہے اور یہ کسر وانکسار صرف معتدل مزاج لوگوں ہی میں ہوسکتا ہے۔ جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن ہوں۔ غیر متوازن لوگ اگر جمع بھی ہوجائیں تو زیادہ دیر جمع نہیں رہ سکتے۔

اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگوں کو چاہیے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق اپنے مزاج اور نقطہ نظر کو ڈھالنے کی کوشش کرنے کی عادت ڈالیں۔ اس سے ان کے اندر وہ توازن اور اعتدال پیدا ہوتا چلا جائے گا جو دنیاوی معاملات کو قرآن وسنت کے دیے ہوئے نقشے پر چلانے کے لیے درکار ہے۔

اخلاقی معاملات میں میانہ روی

امام غزالی نے لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے جن اخلاقی صفات اور بشری ملکات سے انسان کو نوازا ہے، ان میں افراط وتفریط نقصان دہ ہے اور توازن واعتدال پسندیدہ ہے، مثلاً غضب انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ ایک بہیمی صفت ہے۔ لیکن جب اسے شریعت کے تابع کر دیا جائے تو ملکوتی صفت بن جاتا ہے، اگر غضب میں افراط کیا جائے تو یہ انسان کو مشتعل مزاج اور جارح بنا دیتا ہے، اسے تہوّر کہتے ہیں۔ یہ انسان میں بے رحمی پیدا کرتا ہے۔ اور اگر اس میں تفریط کی جائے تو انسان بزدل بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس میں توازن اختیار کیا جائے تو یہ وصفِ محمود "شجاعت" بن جاتا ہے۔ یہی صورتحال

انفاق کی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 29 میں فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا

ترجمہ: "اور نہ باندھ لو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ (یہ استعارہ ہے بخل اور کنجوسی کا، یعنی آپ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر کسی کو کچھ دینے سے خود کو معذور نہ کر لیں) اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ پھر بیٹھے رہو ملامت زدہ ہارے ہوئے۔"

سورۃ الفرقان آیت 67 میں اللہ تعالیٰ "عباد الرحمٰن" کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان: 67)

ترجمہ: "اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ (ان کا معاملہ) اس کے بین بین معتدل ہوتا ہے۔"

اسی طرح سورۃ لقمان کی آیت نمبر 19 میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ

ترجمہ: "اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست رکھو۔ یقیناً سب سے ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔"

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمدؒ بیان فرماتے ہیں کہ یہ میانہ روی صرف ظاہری چال ہی میں مطلوب نہیں بلکہ زندگی کی مجموعی "چال" میں بھی مطلوب ہے۔ خاص طور پر قرآن مجید میں معیشت کی میانہ روی پر بہت زور دیا گیا ہے۔

انفاق میں افراط "اسراف اور تبذیر" ہے جو شیطانی خصلتیں ہیں۔ اور تفریط "بخل" ہے۔ لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن قائم ہو جائے تو اس سے وصف "سخاوت" پیدا ہوتا ہے جو کہ انتہائی پسندیدہ صفت ہے۔ (اگرچہ انفاق میں افراط نیکی کے جذبہ کے تحت بھی ہو سکتا ہے مگر یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر شہوانی وصف بھی رکھا ہے۔ اس میں افراط بے حیائی ہے، فحاشی ہے، آوارگی و بے آبروئی ہے۔ تفریط یعنی مجرد رہنا اوّل تو ویسے ہی نہایت مشکل ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تب بھی دین نے اسے پسند نہیں کیا ہے۔ شہوانی جذبات میں اعتدال و توازن، حیا اور پاک دامنی ہے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا سنتِ نبوی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "النکاح من سنتی" (سنن ابن ماجہ)

یہی معاملہ "انا" کا ہے۔ "انا" کو اعتدال میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر انا حد سے بڑھ جائے تو بے ادبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی انا کی افراط نے "عزازیل" کو "ابلیس مردود" بنا دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر مشکل پڑی تو ان کی زبان پر اللہ کا نام آیا لیکن شیطان کی زبان پر لفظ "اَنا" آیا۔ دوسری طرف "انا" حد سے زیادہ گھٹ جائے گی تو انسان دنیا میں ناکارہ اور بیکار ہو جائے گا۔ اس کی اپنی نظروں میں بھی عزت نہ رہے گی۔ ایک مومن کو اپنے مومن ہونے پر فخر ہونا چاہئے اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے فخر ہونا چاہئے۔ چونکہ میں ایک مومن ہوں۔ لہٰذا مجھے اپنی صلاحیتوں کی حفاظت کرنی ہے۔ ان کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے۔ ان احساسات سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

اگر ہم غور کریں تو ہمیں اس کائنات کے ہر ذرہ میں بھی توازن نظر آئے گا اور بڑے بڑے اجرام فلکی میں بھی۔ اس دنیا کی تمام تر خوبصورتی توازن ہی کے مرہون منت ہے۔ اگر اس کائنات میں ایک لمحہ کے لیے بھی توازن قائم نہ رہے تو یہ کائنات قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

اسی طرح خود ہمارے جسم کے اندر تمام کیمیائی مرکبات میں ایک حسین توازن موجود ہے۔ کسی ایک مرکب میں بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ آج کل سائنس دان ماحولیاتی توازن پر بہت زور دے رہے ہیں۔ تمام چرند و پرند، حیوانات اور زندگی کے لیے ضروری وسائل مثلاً پانی، مختلف اقسام کے پودے، پیداوار، ان سب میں بھی ایک توازن ہے۔ گلوبل وارمنگ اور موسمیاتی تبدیلیاں جیسے موجودہ مسائل اسی وجہ سے ہیں کہ انسان نے اس زمین کے نظام میں عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔

حِلم اور بردباری

حِلم کے معنیٰ ہیں: نفس وطبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ وغضب کے موقع پر بھڑک نہ اُٹھے۔ اردو میں اس کے معنیٰ "بردباری" استعمال ہوتے ہیں۔ سورۃ الصّٰفّٰت آیت نمبر 101 میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوا ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ

ترجمہ: "اور ہم نے انہیں (ابرہیم علیہ السلام کو) بشارت دی ایک بُردبار بیٹے کی۔"

اور سورۃ ہود آیت 75 میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (هود:75)

ترجمہ: "حضرت ابرہیم علیہ السلام بڑے تحمل والے، نرم دل اور (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔"

حِلم کی جمع "اَحْلَام" ہے۔ سورۃ طور آیت نمبر 32 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (طور:32)

ترجمہ: "کیا اُن کی عقلیں انھیں یہی بتاتی ہیں یا وہ سرکش لوگ ہیں۔"

یعنی احلام سے عقلیں مراد ہیں: اصل میں حِلم کے معنیٰ "متانت" اور "بُردباری" کے ہیں مگر چونکہ متانت اور بُردباری بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لیے بسا اوقات حِلم کا لفظ بول کر عقل بھی مراد لیتے ہیں۔ سورۃ النور آیت 59 میں ارشادِ گرامی ہے:

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ (النور:59)

ترجمہ: "اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔"

اس آیت میں "حُلُم" سے مراد سنِ بلوغت کے ہیں۔ سنِ بلوغت کو "حُلُمَ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس عمر میں عام طور پر عقل وتمیز آجاتی ہے۔

"حِلم" ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ اور جسے یہ صفت حاصل ہو گئی اس نے گویا فیضانِ نبوت سے حصہ پالیا۔ ایک حلیم انسان کا فیصلہ انجام کے اعتبار سے زیادہ درست ہوتا ہے۔ چونکہ وہ معاملہ کے عواقب

ونتائج، اس میں درپیش مشکلات اور اس کے نفاذ کے ممکنہ طریقوں پر پہلے غور وفکر کرتا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کرتا ہے۔ انسان جب غصہ کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ حقائق سرے سے اسے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ حقائق کو پرکھے بغیر اندھا دھند فیصلے کر لیتا ہے۔ اس پر بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ غضب کی کیفیت میں اس سے حماقتیں سرزد ہوتی ہیں، اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ نہ اس کا فیصلہ درست ہوتا ہے اور نہ نتائج کے اعتبار سے دیرپا ہوتا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ بسا اوقات میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر خوب بولتے ہیں یہاں تک کہ شوہر غصے کی حالت میں تین مرتبہ طلاق کے الفاظ کہہ دیتا ہے، غصہ ٹھنڈا ہونے پر دونوں پچھتاتے ہیں اور علما سے فتویٰ مانگتے پھرتے ہیں۔ حلیم الطبع شخص کا فیصلہ اس لیے ندامت کا باعث نہیں ہوتا چونکہ وہ ہمیشہ ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ خوب سوچ سمجھ کر پرسکون حالت میں فیصلہ کرتا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 44 میں اللہ تعالیٰ کی شان بیان ہوئی ہے:

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (بنی اسرائیل:44)

"بے شک ہو (اللہ تعالیٰ) بہت بردبار، بہت معاف کرنے والا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات صفت "حلم" سے متصف ہے۔ اس لیے وہ انتقام لینے اور سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔ سورۃ فاطر آیت نمبر 45 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا (فاطر:45)

ترجمہ: "اگر اللہ لوگوں کے کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے ان پر (فوری) گرفت فرماتا تو روئے زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا، لیکن وہ ایک مقرر وقت تک انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ پس جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ لے گا۔"

یعنی اللہ تعالیٰ سزا دینے میں عجلت نہیں فرماتا۔ اگر وہ سزا دینے میں جلدی کرتا تو چند مستثنیات کے سوا روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہتا۔ کیونکہ جب بھی کوئی گناہ کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاک کر دیتا اور گناہ سے تو کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ اگر اللہ کی گرفت جلدی ہوتی تو زمین بنی نوع انسانی سے خالی ہو جاتی اور دنیا کا نظام تباہ وبرباد ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ تو بہت بردبار ہے، بخشنے والا ہے۔

حلم اور بُردباری کی برکت سے اللہ تعالیٰ دو بندوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کو محبت میں تبدیل فرما دیتا ہے۔ جب ایک شخص جاہلانہ برتاؤ کرتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلے میں حلم کا مظاہرہ کرتا ہے تو پہلا شخص ایک بار جہل سے کام لے گا۔ دوسری بار بھی ایسا ہی کرے گا مگر تیسری بار ضرور سوچے گا۔ اپنے طرزِ عمل پر غور کر کے اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر مجبور ہوگا۔ اور اس کے دل میں عداوت کی جگہ دوستی اور محبت وشفقت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ یہی بات سورۃ حم السجدہ آیات نمبر 34 تا35 میں اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٣٥﴾

ترجمہ: "اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں برائی کو بہترین حکمت سے ٹالو، اس کا نتیجہ نکلے گا کہ جس شخص کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے گا۔ اور یہ فراست انہی کو ملتی ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت انہیں کو عطا ہوتی ہے جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔"

پس حلم والے اعلیٰ نصیب کے مالک ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے برائی کا بدلہ برائی سے دینے کے بجائے اچھائی سے دینے کی توفیق عطا کی ہے۔ حلیم شخص اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں میں سے ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اشج بن عبدالقیس سے فرمایا: تم میں دو صفات ایسی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے حلم اور عقل۔ (مسلم)

حلم نرم مزاجی کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتا ہے" (بخاری)

نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور مہربانی اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر ثواب دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا۔ اور نہ اس کے سوا کسی اور عبادت پر دیتا ہے (مسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ نے کسی چیز کا گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جسے کوئی بندہ اللہ کی

رضا کی خاطر پی جائے۔" (مسند احمد)

جن خوش خصال اور پاکیزہ صفت بندوں کے لیے جنت آراستہ کی گئی ہے۔ سورۃ آل عمران آیت نمبر 134 میں ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے:

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ

ترجمہ: "اور وہ اپنے غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے والے ہیں۔"

سہیل بن معاذ اپنے والد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایات کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص غصہ کو پی جائے درآنحالیکہ اس میں اتنی طاقت اور قوت ہے کہ وہ اپنے غصہ کے تقاضے کو نافذ اور پورا کر سکتا ہے (لیکن اس کے باوجود محض اللہ کے لیے اپنے غصہ کو پی جاتا ہے اور جس پر اس کو غصہ ہے، اس کو کوئی سزا نہیں دیتا) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے اس کو بلائیں گے اور اس کو اختیار دیں گے کہ حورانِ جنت میں سے جس حور کو چاہے اپنے لیے منتخب کر لے۔ (جامع ترمذی۔ سنن ابی داؤد)

آج کل تُرکی بہ تُرکی جواب دینے کو ایک اچھی صفت کے طور پر گنا جاتا ہے ایسے شخص کو "حاضر جواب" کہتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہمارے معاشرے میں برداشت، بردباری اور تحمل کے رویے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ فی زمانہ ہمارا سیاسی ماحول اسی لیے کشیدہ ہے کہ سیاسی قائدین نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کو قیادت کا جوہرِ کمال سمجھ لیا ہے۔ ہر سیاسی جماعت اور سیاسی لیڈر کے میڈیا مینیجرز ہیں اور ایک میڈیا ٹیم" ہے جو ہر مخالف کی پگڑی اچھالنے کو اصل سیاست سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بدکاریوں، کرپشن کے معاملات اور دوسرے پوشیدہ جرائم کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ذرا غور کریں نبی اکرم ﷺ کی ذات میں کس قدر حلم تھا۔ آپ ﷺ نے ابوجہل، ابولہب سمیت قریش کے سرداروں کی زیادتی کے مقابلے میں کیسی بردباری اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابیّ سمیت منافقوں اور یہود کی ہرزہ سرائی کا کتنی بردباری کے ساتھ مقابلہ کیا۔

دورِ حاضر میں "سوشل میڈیا" کا ایک نیا عنصر بھی شامل ہوگیا ہے۔ آپ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیڈر کو یا کسی جماعت کے قائدین کو کوئی مخلصانہ مشورہ ہی دے کر دیکھ لیں۔ آپ پر سوشل میڈیا میں دشنام طرازی اور گالم گلوچ کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اس میدان میں مذہبی سیاسی

جماعتوں کے کارکنان کی طرف سے بھی آپ کو "مرصّع و مرقّع" گالیاں سننے کو ملیں گی۔ اور بلا مبالغہ سیاسی جماعتوں کے کارکنوں سے بھی زیادہ لعن طعن سننے کو ملے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر نجران کی بنی ہوئی موٹے حاشیے کی ایک یمنی چادر تھی۔ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کو پکڑ کر اتنے زور سے کھینچا کہ میں نے دیکھا: رسول اللہ کے شانے پر اس کے زور کے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے مجھے اس مال میں سے دینے کا حکم صادر کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرا دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دینے کا حکم فرما دیا۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں، ہماری قوم اور ہمارے مذہبی و سیاسی لیڈروں کو بردباری اور تحمل کے رویے اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تواضع

تواضع کے معنیٰ ہیں "عجز و انکسار" اپنے آپ کو فروتر سمجھنا، دوسروں کو حسبِ مراتب احترام دینا" اس کے دوسرے معنیٰ ہیں: حق کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور شریعت کے حکم کو بلا چون و چرا اں تسلیم کر لینا۔"

دینی امور میں تواضع کے معنیٰ ہیں: رب کی رضا پر راضی رہنا، یعنی بندہ رب کی بندگی اس لیے کرے کہ وہ شارع کا حکم ہے۔ رب کی رضا کی خاطر اپنی رائے، خواہش، مزاج اور عادت کو چھوڑ دے۔ تکبر اور تذلّل دو انتہائی طرزِ عمل ہیں۔ تواضع (humbleness) ان دونوں کے درمیان اعتدال ہے۔

تواضع کی فضیلت:

تواضع ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس متوازن طرزِ عمل کی مدح سرائی فرمائی ہے۔ سورۃ الفرقان آیت نمبر 63 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

ترجمہ: "رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین میں دھیمی چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں بس سلام۔"

وعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ h قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ تعالى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتّٰى لَا يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی اور حکم بھیجا ہے کہ تواضع اور خاکساری اختیار کرو جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے اور کسی کے مقابلے میں فخر نہ کرے۔"

تواضع کی حقیقت:

تواضع دل اور روح کا فعل ہے۔ یعنی انسان جو کچھ بھی حاصل کرے یا اسے کوئی کامیابی حاصل ہو تو اسے اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ نہ سمجھے، اس کا سہرا (Credit) اپنے سر نہ لے بلکہ سراسر اللہ کی دَین سمجھے

اوراس کا شکرادا کرے۔ متواضع لوگ نہ تو عُجب اور خود پسندی کا شکار ہوتے ہیں اور نہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو گھٹیا سمجھتے ہیں، بلکہ اپنے بارے میں بہت کم سوچتے ہیں۔ ان پر ہروقت اپنی شخصیت کا خمار نہیں چھایا رہتا۔

ایک عجز و انکسار اضطراری ہے۔ یعنی حالات کے جبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں: "گدا اگر تواضع کند خوئے اوست" یعنی فقیر اگر عاجزی اختیار نہ کرے تو اُسے خیرات کون دے گا۔ یہ تو اس کی مجبوری ہے۔ ہاں اگر کوئی صاحبِ منصب تواضع اختیار کرے تو یہ اس کا وصف ہوگا۔ اور اس کی خوبی قرار پائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں اسے رفعت اور سرفرازی عطا فرماتا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ سے فرمایا: اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں، میرے پاس ایک فرشتہ آیا، اس کی کمر کعبہ کے برابر تھی۔ اس نے کہا: آپ کا رب آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: آپ چاہیں تو نبوت اور بندگی کو اختیار کرلیں اور چاہیں تو نبوت اور بادشاہت کو اختیار کرلیں۔ تو میں نے جبرائیلؑ کی طرف دیکھا، انہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ عاجزی کو اختیار کریں، تو میں نے کہا: میں نبوت اور بندگی کو اختیار کرتا ہوں۔ (شرح السنہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا فقر اضطراری نہیں بلکہ اختیاری تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے کمزوروں میں تلاش کرو، کیونکہ تمہیں انہی کمزوروں کی (دعاؤں کی) برکت سے رزق عطا کیا جاتا ہے۔ اور نصرت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ (ترمذی)

فقراء صحابہ کرام صہیب، یاسر، عمار، مقداد اور بلال ؓ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے، قریش کے سرداروں اقرع بن جابس اور عینیہ بن حصن وغیرہ نے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ ہمارے لیے ایک وقت مخصوص کردیں جس میں یہ خستہ حال لوگ نہ ہوں تو ہم آپ کی بات سن لیں گے۔ لیکن ان کے ساتھ برابری کی سطح پر بیٹھنا ہماری توہین ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکھف آیت نمبر 28 میں فرمایا:

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا

ترجمہ: "اور اپنے آپ کو روکے رکھیے اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح وشام، وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور آپ ﷺ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپ ﷺ دُنیوی زندگی کی آرائش وزیبائش چاہتے ہیں! اور مت کہنا مانیے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہوچکا ہے۔"

اسی طرح سورۃ الانعام آیت نمبر 52 میں فرمایا:

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

ترجمہ: "اور مت دھتکاریے آپ ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح شام (اور) اس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپ کے ذمہ ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں سے ان کے ذمہ کچھ ہے تو اگر (بالفرض) آپ انہیں اپنے سے دُور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہوجائیں گے۔"

حضرت خباب ؓ فرماتے ہیں: اس کے بعد ہم جب نبی ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے اور مجلس کی برخاست ہونے کا وقت آجاتا تو ہم خود کھڑے ہوجاتے اور رسول اللہ ﷺ کو بیٹھا چھوڑ دیتے یہاں تک کہ آپ ﷺ مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے۔

رسول اللہ ﷺ دعا میں بھی تضرّع اور عجز و انکسار کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل دعاؤں سے ظاہر ہے۔

"اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ جو نفع نہ دے، ایسے قلب سے تیری پناہ میں آتا ہوں جس میں تیرے لیے عاجزی نہ ہو۔ ایسی دعا سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو قبول نہ ہو۔ ایسے نفس سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو کبھی سیر نہ ہو۔ اے اللہ! ہم تجھ سے ایسے دل کا سوال کرتے ہیں جو آہ وزاری کرنے والا ہو اور پیکرِ عجز ہو، جو تیری طرف رجوع کرنے والا۔" آپ سجدہ فرماتے تو یہ دعا پڑھتے":

"اے اللہ! میرا قلب اور قالب دونوں تیری بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں۔ میرا دل تجھ پر ایمان لایا، تو نے مجھ پر جو نعمتیں فرمائیں، میں ان کا اعتراف کرتا ہوں، اے اللہ! مجھے بخش دے۔" (المستدرک)

وعن أبي هُريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ (مسلم)

ترجمہ: "ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "صدقہ نے مال میں کبھی کوئی کمی نہیں کی اور معاف کرنے سے اللہ بندے کو عزت ہی میں بڑھاتا ہے۔ اور کوئی شخص (صرف اور صرف) اللہ کی خاطر تواضع اختیار نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کا مقام بلند کر دیتا ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ متواضع بندہ اپنے دل میں کشادگی رکھتا ہے اور دوسروں کی غلطی معاف کر دیتا ہے۔

وعن معاذِ بنِ أنسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: »مَنْ تَرَكَ اللِّبَاس تواضُعًا لله، وَهُوَ يَقْدِرُ عليْهِ، دعاهُ اللّٰهُ يَوْمَ القِيامَةِ عَلى رُؤُوسِ الخَلائِقِ حَتَّى يُخيِّرَه منْ أَيِّ حُلَلِ الإيمان شَاءَ يلبَسُها (ترمذی)

"جو بندہ بڑھیا لباس کی استطاعت کے باوجود از راہ تواضع وانکساری اس کو استعمال نہ کرے (اور سادہ معمولی لباس ہی پہنے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوقات کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ وہ ایمان کے جوڑوں میں سے جو جوڑا بھی پسند کرے، اس کو زیب تن کرے۔"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: مساکین سے محبت کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دعا کرتے سنا:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّ اَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (ترمذی)

"اے اللہ! مجھے مسکین کی حالت میں زندہ رکھ، اسی حالت میں مجھے موت عطا فرما اور قیامت کے دن مجھے مساکین کی جماعت میں اُٹھا۔"

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ میں اس کی شرح میں لکھا ہے "یہاں مسکین کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امت غریب ہو جائے۔ مسکین کے معنی ہیں اَلْمِسْكِيْنُ مِنَ الْمَسْكَنَةِ وَهِيَ غَلَبَةُ التَّوَاضُعِ عَلٰى وَجْهِ الْكَمَالِ مسکنت کے معنی ہیں کہ غلبۂ تواضع ہو، کمال درجہ کی خاکساری ہو، فقیر اور غریب ہو جانا مراد نہیں ہے۔" بعض حضرات ڈر کے مارے یہ دعا نہیں مانگتے کہ کہیں غریب نہ ہو جائیں۔ لیکن غور کریں کتنے صحابہ مال دار تھے، زکوٰۃ ادا کرتے تھے، صدقہ خیرات دیتے تھے، اگر مسکین سے مفلس

ہونا مراد ہوتا تو سارے صحابہ مفلس ہو جاتے۔ مراد یہ ہے کہ دل مسکین ہو، ہاتھ میں پیسہ ہو، جیب میں پیسہ ہو لیکن دل میں مال کی محبت نہ ہو، مال خوب ہو لیکن مال کا نشہ نہ ہو۔

عام طور پر ہر بڑے آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ کم تر اور کم عمر اسے سلام میں پہل کریں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا شِعار یہ تھا کہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی اکرم ﷺ کا گزر بچوں کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں سلام کیا اور یہی آپ ﷺ کا معمول تھا (بخاری)

لوگ بعض پیشوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا شِعار اس سے مختلف تھا۔

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبيِّ ﷺ قال: ما بَعَثَ اللهُ نبياً إلا رَعَى الغَنَمَ فقالَ أصحابُهُ: وأنت؟، قال: نعم، كُنتُ أرعَاها على قَرَارِيطَ لأهلِ مكةَ۔

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جو بھی نبی بھیجا، اس نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں چند قیراط کے عوض مکے والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔" (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ اپنے گھر کا کام کرتے، اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے، اپنے جوتے مرمت فرماتے اور گھر کے مردانہ کام بھی کرتے تھے۔ (مسند احمد)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا: لوگو! تواضع اختیار کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جو اللہ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اللہ اسے سربلندی عطا فرماتا ہے، وہ اپنے دل میں اپنے آپ کو معمولی سمجھتا ہے، جبکہ لوگوں کی نظر میں وہ عظیم القدر ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے، اللہ اسے گرا دیتا ہے، وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، لیکن لوگوں کی نظر میں حقیر ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضور اکرم ﷺ نے ہمیں ایک بہت پیاری دعا سکھائی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ صَبُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ شَكُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا۔ (مجمع الزوائد)

ترجمہ: "اے اللہ! مجھے صبر کرنے والا بنا اور مجھے شکر کرنے والا بنا اور مجھے میری آنکھ میں چھوٹا بنا (یعنی تواضع والا بنا اور تکبر سے بچا) اور لوگوں کی آنکھوں میں بڑا بنا۔"

تلخ مزاجی دور کرنے کے لیے یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ، وَالْأَعْمَالِ وَالْأَهْوَاءِ.

ترجمہ: "اے اللہ! میں برے اخلاق، برے اعمال اور بری خواہشات سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

دورِ حاضر کا ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ ہر مرد و زن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میں دوسروں سے منفرد نظر آؤں میرا لباس دوسروں سے منفرد ہو۔ میرے بچے کا نام کوئی Unique ہونا چاہیے۔ ہم سب نے اپنے کچھ نہ کچھ Status Symbols بنائے ہوئے ہیں۔ میرے بچے بیکن ہاؤس، LGS یا برٹش گرائمر سکول میں پڑھتے ہیں۔ میرے پاس ایپل کا Latest موبائل فون ہے۔ نئے ماڈل کی گاڑی ہے۔ ہم مختلف ڈیزائین کے شوخ کپڑے پہن کر سیلفی لے کر فیس بک پر اپ لوڈ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ دل کے کسی چور خانے میں کہیں تکبر موجود ہے۔ ان تمام چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ لباس میں سادگی اپنانی چاہیے، لباس شائستہ ہو، صاف ستھرا ہو، بہت قیمتی نہ ہو، ضرورت کے مطابق موبائل یا گاڑی استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ استعمال کرنے میں ہماری نیت کیا ہے۔ ہماری ضرورت ہے یا دکھاوا۔ درج بالا تمام امور تواضع کی نفی کرتے ہیں۔

تواضع دراصل تکبر اور ریا کاری سے بچتے ہوئے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے کہ انسان دوسری انتہا احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو بہت حقیر سمجھنے لگے، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ کم ہمتی کا شکار ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر آپ ایک مدرّس ہیں، درس کے بعد لوگ آکر آپ کے درس کی تعریف کرتے ہیں یا آپ کا درجہ حد سے زیادہ بڑھا رہے ہیں۔ تو آپ اپنی اس صلاحیت کو اللہ کا عطیہ سمجھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے تو درس دینا ہی نہیں آتا۔ یا لوگوں کے علم میں آپ کی کوئی نیکی آگئی اور لوگ آپ کی نیکی کی وجہ سے آپ کو بہت بزرگ اور نیکوکار سمجھنے لگیں تو یہ مت کہیں کہ میں تو بہت گنہگار رہوں۔

البتہ ایسے مواقع کے لیے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے منقول ایک بہت پیاری دعا ہے:

اَللّٰهُمَّ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا يَقُولُونَ وَاغْفِرْ لِي مَا لَا يَعْلَمُونَ وَاجْعَلْنِي خَيْرًا مِمَّا يَظُنُّونَ

ترجمہ: "اے اللہ میری گرفت نہ فرما جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ میرے وہ گناہ معاف کر دے۔ جو ان لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ اور مجھے ان کے گمان سے زیادہ بہتر بنا دے۔"

اگر بغیر کسی وجہ کے آپ کو اپنے اندر عُجب محسوس ہو رہا ہے، تو اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا

جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر ؓ اپنے دورِ خلافت میں منبر آئے، لوگوں سے خطاب کیا اور اپنا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اے عمر! تو وہی ہے جو کے میں بکریاں چرایا کرتا تھا" لوگ بہت حیران ہوئے۔ بعض نے کہا اے امیر المومنین! یہ آپ نے کیا بات کی۔ آپ نے جواب دیا کہ ایک دن میرے دل میں خیال آیا، واہ عمر! آج تیرے پاس کتنی بڑی ریاست ہے۔ بس یہ خیال آیا تو میں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ میں لوگوں کو بتا دوں کہ میری اصل حقیقت کیا ہے۔ حضرت عمر ؓ کے دل میں تقویٰ تھا تو وہ فوراً شیطانی وسوسہ کو پہچان گئے۔ اس سے بیشتر کہ وہ وسوسہ انہیں نقصان پہنچاتا اور ان کی تمام نیکیاں برباد ہو جاتیں۔ انہوں نے اس کا علاج کر لیا۔

فرض کریں اس طرح آج کوئی ہماری گاڑی کی تعریف کرے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا میں بھی ویگنوں اور بسوں میں سفر کیا کرتا تھا۔ اب ہم کسی پوش علاقہ میں رہتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرا بچپن اندرون شہر کی تنگ گلیوں میں کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔

تکبر سے بچنے اور تواضع کی عادت ڈالنے کے طریقے۔

یاد رہے کہ تواضع تکبر اور تذلّل کی درمیانی کیفیت یعنی اعتدال کا راستہ ہے۔

تکبر سے بچنے کا طریقہ تو یہ ہے کہ:

(i) وہ قرآنی آیات جن میں اللہ تعالیٰ کے جلال و کبریائی کا ذکر ہے، انہیں تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اور ان میں سے بعض کو اپنا ورد بنا لیا جائے۔ مثلاً تیسرے کلمہ کا زیادہ سے زیادہ ورد کریں۔

(ii) جماعت میں نماز کی اس طرح پابندی کہ صف میں اپنے قریب والے نمازی سے بالکل جڑ کر کھڑے ہونے کی عادت ڈالیں، خاص طور پر اگر آپ کے ساتھ کوئی غریب مسکین آکر کھڑا ہو جائے۔

(iii) بچوں اور اپنے سے کم رتبہ والے لوگوں کے سلام کرنے میں پہل کریں۔

(iv) کثرتِ استغفار

(v) جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے نعمتیں عطا کی ہیں، ان پر بار بار کثرت سے اللہ کا شکر ادا کریں۔

دوسری طرف تواضع کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بندہ اللہ دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دے۔ سورۃ والضحیٰ آیت نمبر 11 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

"اور جو نعمت آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ کو دی ہے، اس کو بیان کیجئے۔"

بندہ اپنی خوبی کو پہچانے گا تبھی احسن طریقے سے اپنی ذمہ داری بھی ادا کرے گا۔ البتہ اپنی خوبی کو اپنا وصف کمال نہیں سمجھنا چاہئے، انسان یہ سوچے کہ میں اس عنایت، اس مقام کا مستحق نہیں تھا۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اور اس لیے عطا فرمائی ہے کہ وہ مجھ سے یہ کام لینا چاہتا ہے۔ تو مجھے یہ کام کرنا چاہئے۔ میں تو اللہ کا بندہ اور غلام ہوں۔ وہی اس کام کو احسن طریقے سے کرنے کی مجھے توفیق بھی دے گا۔

حیا کا مفہوم اور اس کے تقاضے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے اور صرف انسان ہی کو خیر اور شر کا شعور بخشا ہے۔ سورۃ الشمس آیت نمبر 8 میں فرمان الٰہی ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا

"پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری اس کے دل میں ڈالی۔"

پھر صرف خیر اور شر کا شعور بخش کر ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ انسان کے نفس میں ایک ایسی قوت اور استعداد بھی رکھ دی جس کی وجہ سے انسان فطری طور پر خیر اور اصلاح کے کاموں کی طرف بڑھنے کا رجحان رکھتا ہے اور شر اور برائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی قوت یا ملکہ کا نام "حیا" ہے۔ خیر اور شر کے باطنی جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جو صرف اپنی علامات کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ خیر کی بہترین علامت "حیا" ہے اور شر کی علامت "بے حیائی" ہے۔

ابو حیان اندلسی کے بقول معیوب اور قابلِ مذمت افعال صادر ہونے کے خوف سے انسانی طبیعت میں گھٹن کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسے "حیا" کہتے ہیں۔ اس کا منبع دل ہے اور اس کا مظہر چہرہ ہے۔ اسکی ضد بے حیائی اور غیر پسندیدہ کاموں پر جری ہونا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں "جس کام کے ارتکاب کی صورت میں کسی شخص کو ملامت کو خوف ہو اور اس بنا پر اس کام کو کرنے میں گھٹن کی کیفیت پیدا ہو تو اس کیفیت کو لغت میں "حیا" کہتے ہیں۔ شریعت کی نظر میں حیا کا مفہوم ہے "ایسا وصف جو انسان کو برے کاموں سے رکنے پر ابھارے اور حق داروں کے حقوق میں کمی و کوتاہی کرنے سے روکے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ "حیا پوری کی پوری خیر ہے۔" (فتح الباری ج 1 ص 55)

بنیادی طور پر حیا کی دو قسمیں ہیں: حیا کی ایک قسم تو نفسانی ہے۔ حیا کا یہ وصف اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ جیسا کہ لوگوں کے سامنے شرمگاہ کھولنا یا ایسے ہی کسی اور فحش کام کا ارتکاب کرنا۔ دوسری قسم ایمانی ہے وہ یہ ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے خوف کی بناء پر گناہوں کے ارتکاب سے رک جائے۔ حیا کے مختلف درجات ہیں اور اس کا کامل ترین درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک

سے حیاء کرے۔ اور اس کی تشریح یوں کی گئی ہے" وہ تمہیں ایسی جگہ موجود نہ پائے جہاں قدم رکھنے سے اس نے تمہیں منع کیا ہے اور اس جگہ سے تمہیں غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! الحمد اللہ ہم سے حیا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حیا کا یہ حق نہیں جو تم نے سمجھا ہے۔ اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تم اپنے سر (اور دماغ) میں موجود تمام افکار کی حفاظت کرو اور تم اپنے پیٹ اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس کی حفاظت کرو اور موت اور ہڈیوں کے گل سڑ جانے کو یاد کرو اور جسے آخرت کی چاہت ہو وہ دنیا کی زینت کو ترک کردے۔ جس نے اس طرح کیا تو حقیقت میں اسی نے اللہ تعالیٰ سے حیا کی جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے۔ (ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پاکیزہ انسان اپنی سوچ کو بھی پاکیزہ رکھتا ہے۔ بطن اور باطن کی حفاظت کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ لقمہ حلال کھاتا ہے اور شہوت پرستی نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے حیا کا ملکہ اور اس کی استعداد روزِ اول ہی سے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی فطرت میں ودیعت کردی تھی۔ چنانچہ جب حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو شیطان کے ورغلانے کے باعث بے لباس کردیا گیا تو اس کے بارے میں قرآن مجید سورۃ الاعراف آیت نمبر 22 میں بیان کرتا ہے۔" پھر شیطان نے فریب سے انہیں اپنی طرف مائل کرلیا۔"

غرض زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ صورتیں تو بدلتی رہی ہیں اور بدلتی بھی رہیں گی مگر شیطان کا حربہ آج بھی وہی ہے جو ابتدائے کائنات سے تھا کہ اسے بے لباس کردے، برہنگی بے حجابی اور بے حیائی کے کاموں میں مبتلا کردے۔

خیر وصلاح کے جملہ محاسن کی اصل شرم وحیاء ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"شرم وحیا اپنے ساتھ خیر ہی لے کر آتی ہے۔" (بخاری)

ایک اور حدیث میں فرمایا: حیا پوری کی پوری خیر ہے (مسلم) حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: تمام اخلاق وصفات میں سب سے افضل اور قدر ومنزلت کے اعتبار سے سب سے زیادہ نفع بخش صفت حیا ہے۔ بلکہ یہ انسانی خواص میں سے ہے۔ جس شخص میں حیا نہیں، وہ انسان نہیں محض گوشت پوست کا ایک

ٹکڑا ہے۔ حیا ہی کے سبب مہمانوں کا خیال رکھا جاتا ہے، وعدے وفا کیے جاتے ہیں۔ امانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اچھائیوں اور خوبیوں کو حاصل کیا جاتا ہے، عفت و پاکیزگی اختیار کی جاتی ہے۔ خلق خدا کے حقوق کی رعایت کی جاتی ہے۔ اگر حیا نہ ہوتی تو مہمان نوازی کی قدر فروغ نہ پاتی، وعدے وفا نہ ہوتے، امانت کا پاس نہ رکھا جاتا، محتاجوں کی حاجت برآری نہ ہوتی، انسان کمالات کا خوگر نہ ہوتا، برائیوں سے کنارہ کش نہ ہوتا، شرمگاہوں کی حفاظت نہ ہوتی۔ فحاشی سے اجتناب نہ کرتا، خلقِ خدا کے حقوق کا تحفظ نہ ہوتا، صلہ رحمی نہ ہوتی، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک نہ ہوتا۔ غرضیکہ جملہ افعالِ خیر کا منبع اور سرچشمہ حیا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسانوں کو خیر وصلاح پر ابھارتی ہے۔ اور برائیوں سے روکتی ہے۔ خالق اور اس کی مخلوق سے حیا نہ ہوتی تو پھر خیر کا وجود نہ ہوتا۔

سورۃ النور آیت 30 تا 31 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ترجمہ" (اے نبی ﷺ!) مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے بہت ستھرا ہے۔ بیشک اللہ کو ان کے کاموں کی خبر ہے۔ اور مسلمان عورتوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ نہ دکھائیں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ یا شوہروں کے باپ یا اپنے بیٹے یا شوہروں کے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے بھتیجے یا اپنے بھانجے یا اپنے دین کی عورتیں یا اپنی کنیزیں جو اپنے ہاتھ کی ملک ہوں یا نوکر بشرطیکہ شہوت والے مرد نہ ہوں یا وہ

بچے جنہیں عورتوں کی شرم کی چیزوں کی خبر نہیں اور زمین پر پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ جانا جائے ان کا چھپا ہوا سنگھار اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! تم سب کے سب اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔"

بعض اوقات انسان لوگوں کے ڈر سے بے حیائی کی باتوں کو ترک کر دیتا ہے لیکن جب تنہائی میں ہوتا ہے تو اسے بے حیائی کے ارتکاب میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت کے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں کی مثل نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں بے حیثیت اور پراگندہ ذروں کی طرح بکھیر دے گا۔

حیا کے فروغ کے لیے عملی اقدامات

اگر واقعی ہمارے اندر برائی سے نفرت اور بھلائی کے کام کرنے کا جذبہ بیدار ہے یا بیدار ہوجائے، دونوں صورتوں میں ہمیں دنیا وآخرت میں کامیابی کے لیے درج ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ تاکہ شرم وحیا کو فروغ حاصل ہو۔ ان اقدامات کا آغاز الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنی ذات اور اپنے گھر ہی سے ہوگا۔

1- ستر وحجاب کے احکامات کے مطابق ہمیشہ ساتر لباس کا انتخاب کرنا۔

2- مخلوط محافل ورسومات سے مکمل اجتناب اور شرعی پردہ کو رواج دینا۔

3- گھر اور گھر سے باہر غضِ بصر یعنی نظر کی حفاظت کو یقینی بنانا۔

4- پاکیزہ گفتگو کا اہتمام اور غیر اخلاقی رویوں سے پرہیز۔

پاک دامنی حاصل کرنے کے لیے مسنون دعائیں

پاک دامنی وہ اعلیٰ صفت ہے جس کی نبی ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ اپنی ذات میں معصوم تھے۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو عفت وپاک دامنی سے کتنی محبت تھی۔ دوسرے یہ کہ امت کی تعلیم کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعائیں مانگیں۔ چنانچہ احادیث میں کئی ایسی دعائیں منقول ہیں جن میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے آنکھ اور دل کی پاکیزگی کا سوال کیا ہے اور عفت وعصمت کی تمنا کی ہے۔

چند ایک دعائیں درج ذیل ہیں:-

1- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی

"اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، پرہیزگاری، پاک دامنی اور غنا کا سوال کرتا ہوں۔"

2- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَا بِالْقَدَرِ

"اے اللہ! میں تجھ سے صحت، پاک دامنی، امانت، اچھے اخلاق اور رضا بالقدر کا سوال کرتا ہوں"

3- اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَاءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرِ

"اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کر دے۔ بے شک تو آنکھوں اور سینہ کی پوشیدہ خیانتوں کو جانتا ہے"

4- اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

"اے اللہ! مجھے الہام فرما میری ہدایت اور میرے نفس کے شر سے مجھے دور فرما"

5- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَاءِ

"اے اللہ! میں ناپسندیدہ اخلاق، اعمال اور خواہشات سے تیری پناہ چاہتا ہوں"

6- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ وَمِنْ شَرِّ لِسَانِیْ وَمِنْ شَرِّ قَلْبِیْ وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ

"اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنے کان کی برائی سے، آنکھ کی برائی سے، زبان کی برائی سے، دل کی برائی سے اور منی کی برائی سے۔"

ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنی زندگی میں ان دعاؤں کے مانگنے کا معمول بنائیں تاکہ ان کی برکت سے عفت وپاک دامنی والی زندگی نصیب ہو۔

خوف ورَجا

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ وہی اس کا خالق و مالک ہے اور وہی بالفعل اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے اور یہ مقصدِ تخلیق عبث و بے کار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ بلکہ اسے سماعت، بصارت اور دل و دماغ کی صلاحیت عطا فرمائی۔ اسے خیر اور شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کی، اپنے احکامات کا پابند بنایا۔ اور اب وہ انسان کو آزمانا چاہتا ہے کہ وہ ان صلاحیتوں سے کام لے کر اس دنیا میں اس کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارتا ہے یا نافرمان اور ناشکرا بن کر۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی تعمیل یا عدم تعمیل کی صورت میں آخرت میں بنی نوع انسان کے لیے جزا و سزا کا نظام قائم فرمایا اور جہنم اور جنت بھی اسی مقصد کے لئے پیدا فرمائے۔

انبیائے کرام علیہم السلام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبشیر و انذار کا فریضہ ادا کرتے رہے ہیں، یعنی نیک کاموں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جزا کی بشارت دینا اور برے کاموں پر اس کے عذاب اور برے انجام سے ڈرانا۔ تاکہ بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کا خوف بھی ہو اور اس کی رحمت کی کامل امید بھی رکھتا ہو۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جوان کے پاس اس کے آخری وقت میں جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا، تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا۔ اس وقت تم اپنے آپ کو کس حال میں پاتے ہو؟" اس نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا حال یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید بھی رکھتا ہوں اور اسی کے ساتھ مجھے اپنے گناہوں کی سزا اور عذاب کا ڈر بھی ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یقین کرو جس دل میں امید اور خوف کی یہ دونوں کیفیتیں ایسے عالم میں (یعنی وفات کے وقت میں) جمع ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ ضرور عطا فرمادیں گے، جس کی اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے اور اس عذاب سے اس کو ضرور محفوظ رکھیں گے جس کا اس کے دل میں خوف و ڈر ہے۔" (جامع ترمذی)

یہی وجہ ہے کہ علماء کہتے ہیں کہ ایمان، خوف اور رَجاء کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ اسی روح ایمان کی معراج حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کلمات میں بیان فرمائی۔ "اگر کل قیامت کے دن یہ اعلان

کر دیا جائے کہ سوائے ایک آدمی کے کوئی اور جنت میں نہیں جائے گا تو مجھے اپنے بارے میں یہ گمان رہے گا کہ شاید وہ میں ہی ہوں اور اگر یہ منادی کر دی جائے کہ سوائے ایک آدمی کے دوزخ میں کوئی نہیں جائے گا تو مجھے یہی خوف رہے گا کہ کہیں وہ میں ہی تو نہیں ہوں۔" (کیمیائے سعادت، ص، 926)

اس بات کا ثبوت درج ذیل روایات سے بھی ہوتا ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحب زادہ ابو بردہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ میرے والد نے تمہارے والد سے کیا بات کہی تھی؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔؟ انہوں نے کہا کہ میرے والد نے تمہارے والد سے کہا تھا کہ اے ابوموسیٰ! کیا تم اس پر خوش اور راضی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہمارا اسلام لانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا ہجرت کرنا اور جہاد کرنا اور ہمارے وہ سارے اعمال جو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے، وہ تو ہمارے لیے ثابت اور محفوظ رہیں۔ (اور ان کا صلہ اور اجر ہم کو عطا فرمایا جائے) اور ہم نے جو اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کئے ان سے ہم برابر سرابر پر چھوٹ جائیں۔ تمہارے والد نے کہا کہ نہیں۔ خدا کی قسم، میں تو یہ نہیں چاہتا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جہاد کئے ہیں، نمازیں پڑھی ہیں۔ روزے رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے اعمالِ خیر کئے ہیں، ہماری کوششوں سے ہمارے ہاتھوں پر بے شمار بندے مسلمان ہوئے ہیں اور ہم اللہ سے اپنے ان تمام اعمال کے اجر کی پوری پوری امید رکھتے ہیں۔ اس پر میرے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے پھر فرمایا کہ قسم اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضہ میں عمر رضی اللہ عنہ کی جان ہے۔ میں تو دل سے یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے وہ عمل (جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے وہ تو) ہمارے لیے ثابت رہیں اور ہم کو ان کا صلہ عطا کیا جائے اور جو عمل ہم نے آپ کے بعد کئے ان سے ہم برابر سرابر پر چھوٹ جائیں۔ ابو بردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ خدا کی قسم تمہارے والد (حضرت عمر) میرے والد (ابو موسیٰ اشعری) سے افضل تھے۔ (بخاری)

یہ تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امید اور خوف کی کیفیت۔ صحیح بخاری ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت کی ایک روایت میں ان کا یہ ارشاد بھی ذکر کیا گیا ہے۔ "اللہ کی قسم! اگر میرے پاس زمین بھر سونا ہو تو اللہ کے عذاب کے دیکھنے سے پہلے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالوں اور اپنی جان چھڑا لوں۔"

بندوں کو عذاب دینا تو اللہ کے تشریعی نظام کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کی رضا یہ ہے کہ بندے اس کی اطاعت کر کے اجرِ عظیم کے حقدار بنیں اور اس کی جنت کی نعمتوں سے فیض یاب ہوں۔ سورۃ النساء آیت نمبر 147 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا

ترجمہ: "اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو اور (خالص) ایمان لے آؤ اور اللہ تو بہت قدردان اور بہت جاننے والا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی بشری تقاضے کی وجہ سے سیدھے راستے سے بھٹک جائے تو اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ نہیں فرماتا بلکہ اس کی واپسی کے لیے دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ وہ اپنے بندے کو مایوس اور ناامید نہیں دیکھنا چاہتا، اسی لیے اس نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ ابو سعید ابو الخیر نے رحمت باری تعالیٰ کی پکار کو ایک رُباعی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

ترجمہ: "اے میرے بندے! اگر تو راہِ راستی سے بھٹک گیا ہے تو جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے، واپس پلٹ آ۔ اگر تو کافر، آتش پرست اور بت پرست ہے، تب بھی واپسی کا راستہ کھلا ہے۔ ہماری بارگاہ ناامیدی کی جگہ نہیں ہے اگر تو نے سو بار بھی پیمانِ وفا باندھ کر توڑ دیا ہے تب بھی پلٹ کر ہماری رحمت کی آغوش میں آجا۔"

ریاض خیر آبادی کہتے ہیں۔

جام ہے توبہ شکن، توبہ میری ہے جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

یعنی میرے سامنے ٹوٹے ہوئے جاموں کے پیمانوں اور ٹوٹے ہوئے پیمانِ وفاؤں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات تخویف و انذار (خوف دلانا اور خبردار کرنا) پر مشتمل ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ

نے اپنی قدرت، قہر و جلال اور مجرمین پر اپنے عذاب اور غضب کا ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات سے بندے کے دل میں خوف کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف متعدد آیات وہ بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و مغفرت اور عفو و درگزر کا ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات سے بندے کے دل میں امید اور رجا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ عام حالات میں ان دونوں صفات کا اعتدال کی حد میں ہونا قابلِ تعریف وصف ہے۔ اتنا زیادہ خوف کہ بندہ مایوسی اور ناامیدی کی حد تک پہنچ جائے یا اتنا پر امید ہو جانا کہ خوف بالکل ہی ختم ہو جائے اور بندہ گناہ اور نافرمانی پر بے باک ہو جائے، یہ دونوں صفات معیوب ہیں۔

سورۃ یوسف آیت نمبر 87 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

ترجمہ: "اللہ کی رحمت سے کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔"

سورۃ الزمر آیت نمبر 53 میں ارشادِ ربانی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

"(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے: اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف فرما دے گا۔ یقیناً وہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

سورۃ الاعراف آیت نمبر 156 میں فرمانِ الٰہی ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ (الاعراف:156)

"اور تو ہمارے لیے اس دُنیا (کی زندگی) میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی۔ ہم (اس غرض کے لئے) آپ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا کہ میں عذاب میں مبتلا کروں گا جس کو چاہوں گا اور میری رحمت ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔ تو اسے میں لکھ دوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو لوگ ہماری آیات پر پختہ ایمان رکھیں گے۔"

سورۃ النساء آیت نمبر 116 میں ارشادِ الٰہی ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

ترجمہ: "اللہ ہرگز نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے (یعنی توبہ کیے بغیر مر جانے کی صورت میں) اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لیے چاہے گا۔"

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان اور بے حد شفیق ہے۔ اس کی رحمت اور عفو و کرم کی کوئی انتہا نہیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بندہ گناہوں اور نافرمانیوں پر دلیر ہو جائے اور جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور پھر کہے کہ "پرواہ نہیں اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے"

یہ تو یہود کا طرزِ عمل تھا۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۃ الاعراف آیت نمبر 169 میں فرماتا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا

ترجمہ: "پھر ان (یہودیوں) کے بعد اُن کی جگہ ایسے جانشین آئے جو کتاب (تورات) کے وارث بنے، مگر ان کا حال یہ ہے کہ اس ذلیل دنیا کا ساز و سامان (رشوت میں) لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ہماری بخشش ہو جائے گی۔"

آج بھی جاہل صوفی اور واعظ ایسے ہی لوگوں کو شہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یا فلاں بزرگ تمہاری شفاعت کریں گے اور تمہیں بخشوا دیں گے۔۔۔ تم جیسے بھی ہو اور جو بھی ہو، ہو تو رسول اللہ ﷺ کی امت سے، تمہارا کام بس یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان بزرگوں سے محبت کا دم بھرتے رہو۔

درحقیقت ایمان خوف و رَجا کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ کوئی بندہ اگر شامتِ اعمال سے گناہ کر بیٹھے اور اپنے کیے پر نادم ہو تو اسے یاس اور قنوطیت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کی رحمت سے ناامیدی گناہ کبیرہ ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے بنی آدم! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ رکھے گا، میں تجھے بخشتا رہوں گا، چاہے تیرے گناہ کسی بھی درجہ پہنچے ہوں اور میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا، اے بنی آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کو چھونے لگیں، پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرنے لگے تو

میں تجھے بخش دوں گا اور میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا، اے بنی آدم! اگر تو زمین برابر بھی گناہ کر بیٹھے اور پھر مجھ سے ملے، لیکن میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اس کے برابر مغفرت لے کر آؤں گا (اور تجھے بخش دوں گا) (سنن ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا فرما چکا تو اپنی کتاب (لوحِ محفوظ) میں جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، لکھا: بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے، (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کہتا ہے کہ میں (اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں۔ وہ میرے بارے میں اچھا گمان رکھے گا تو اس کے لیے اچھائی ہے۔ اور اگر وہ میرے بارے میں برا گمان رکھے تو اس کے لیے برائی ہے۔ (مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس دن اللہ تعالیٰ نے رحمت کو پیدا کیا تو سو رحمتیں پیدا کیں۔ ننانوے رحمتیں اس نے اپنے پاس رکھ لیں اور تمام مخلوق کے پاس ایک رحمت بھیجی۔ اگر کافر یہ جان لیتا کہ اللہ کے پاس کتنی رحمت ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا اور اگر مومن یہ جان لیتا کہ اس کے پاس کل کتنا عذاب ہے تو وہ دوزخ سے بے خوف نہ ہوتا۔ (صحیح بخاری)

لیکن ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بخشش و مغفرت کی طرف تو نگاہ رکھے لیکن اپنے اعمال اور کردار کی درستگی کی طرف توجہ نہ دے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے بے خوف ہو جائے یہ کیفیت انسان کو گناہوں پر دلیر اور جَری کر دیتی ہے اور وہ اپنے گناہوں کی طرف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے گناہوں پر کبھی شرمندگی نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ کیفیت رَجا اور امید نہیں ہے۔ بلکہ صریحاً حماقت اور نادانی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے لیکن اس کی پکڑ اور گرفت بھی ایسی ہے کہ پھر اس سے کوئی چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔

چنانچہ سورۃ الحجر آیات 49-50 میں ارشادِ الٰہی ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝

"(اے نبی ﷺ!) میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ میں یقیناً بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہوں۔ اور یہ کہ میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے۔"

سورہ المائدہ آیت نمبر 98 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (المائدہ:98)

ترجمہ: ”جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے اور یہ کہ اللہ غفور اور رحیم بھی ہے۔“

سورۃ الاعراف آیت 99 میں فرمان الٰہی ہے۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (الاعراف:99)

ترجمہ: ”کیا وہ امن میں (یا بے خوف) ہیں اللہ کی چال سے؟ اللہ کی چال سے کوئی اپنے آپ کو امن میں محسوس نہیں کرتا مگر وہی لوگ جو خسارہ پانے والے ہیں۔“

درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو متنبہ فرما دیا ہے کہ وہ صرف غفور اور رحیم ہی نہیں بلکہ شدید العقاب بھی ہے۔ یعنی سخت اور دردناک سزائیں دینے والا بھی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور مغفرت کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے عذاب کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ اس کے بندے گناہوں پر بے باک نہ ہو جائیں۔ پاک اور سچا مومن کبھی اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے بے خوف اور مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ تو منافقوں اور کفار کی علامت ہے کہ گناہوں اور بداعمالیوں کے باوجود بے فکر رہتے ہیں۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن اپنے گناہوں کے بارے میں اس طرح پریشان ہوتا ہے کہ گویا وہ پہاڑ تلے دبا ہوا ہے اور اسے اپنے اوپر پہاڑ گرنے کا خوف ہے۔ جبکہ کافر و فاجر اپنے گناہ کو مکھی کی مانند ہلکا سمجھتا ہے کہ گویا مکھی اس کی ناک پر بیٹھی اور اس نے اپنے ہاتھ سے اسے اڑا دیا (بخاری)

نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: وہ شخص احمق ہے جو نفسانی خواہشات کی اتباع کرے اور پھر رحمت خداوندی کی امید بھی رکھے۔ انسان جب غفلت اور جہالت کے پردوں سے نکل کر اپنے گناہوں، خطاؤں، جرائم، عیوب، خباثتوں اور عبادت کی آڑ میں کی ہوئی ریاکاریوں سے آگاہ ہو جاتا ہے، اسے یہ بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بے شمار نعمتوں سے نواز رہا ہے اور وہ اس کا شکر گزار بندہ بننے کے بجائے نافرمانی کرتا رہا ہے۔ پھر اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا کوئی بھی جرم اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر حال میں اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے حد غیرت مند، بااختیار بادشاہ ہے اور وہ انتقام لیے بغیر نہیں رہے گا۔ مزید یہ کہ اللہ کے غضب سے بچنے کے لے اس کے پاس کوئی وسیلہ، اور اس کا کوئی مددگار بھی ایسا نہیں جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کر سکتا ہو تو اب جب وہ

اپنے آپ کو اس طرح کے خطرات میں گھرا ہوا پائے گا تو اس کے خوف کی کیا حالت ہوگی۔

اب ایک ایسے نیک شخص پر غور کریں جو اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر گزار بھی ہے۔ اور یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات سے بھی آگاہ ہے۔ اس کی عظمت وجلال کو بھی پہچانتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہے۔ یہ شخص بھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزاں وترساں ہے۔ یہ شخص تو اللہ تعالیٰ کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل رہنے کو گناہ سمجھتا ہے اور خوفزدہ ہے کہ کل میدان حشر میں جب اللہ تعالیٰ مجھ سے میری غفلت یا میرے اخلاص میں کمی کے بارے میں سوال کرے گا تو میں کیا جواب دوں گا۔

خوف کا ایک مقام انبیائے کرام علیہم السلام کا ہے۔ اپنی عصمت کا علم ہونے کے باوجود انبیائے کرام پر بھی اللہ تعالیٰ کا خوف طاری رہتا تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت رکھتا ہوں لیکن اللہ کی قسم میں ہی سب سے زیادہ اس کی قدرت وجلالت کا خوف رکھتا ہوں۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنی وفات سے تین روز قبل فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص نہ مرے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھتا ہو“ (صحیح مسلم)

پس انسان کو چاہئے کہ اپنی حدِ استطاعت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہوئے اللہ سے امید رکھے کہ وہ اس کو بخش دے گا۔ اور ساتھ ہی ڈرتا بھی رہے کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی یا گناہ نہ ہو جائے جس سے میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے۔ پھر ہمیں یہ بھی اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ہمارے تمام اعمال خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لیے ہیں کہ نہیں۔

ادب اور احترام

"ادب" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا اردو میں مفہوم ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ "کسی چیز کی حد نگاہ میں رکھنا" حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا، تہذیب، شائستگی اور تمیز"

پہلے زمانے میں استاد کو مؤدب بھی کہا جاتا تھا۔ یعنی "ادب سکھانے والا"۔ اس وقت اساتذہ بچوں کو متعلقہ علوم پڑھانے کے ساتھ ساتھ "آداب" بھی سکھایا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلم معاشرے کی روایت تھی۔ لہذا علم کے ساتھ ساتھ ادب بھی آنا چاہیے۔

اللہ کا ادب:

سب سے پہلے ہمیں "اللہ کا ادب" کرنا آنا چاہیے۔ اللہ کے ادب کا سب سے پہلا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ سورۃ لقمان کی آیت نمبر 13 میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"

یعنی اللہ کا جو مقام ہے، اسے اسی مقام پر رکھا جائے۔ نہ تو مخلوق میں سے کسی کا مرتبہ بڑھا کر اللہ کے برابر کیا جائے اور نہ ہی اللہ کو اس کے اعلیٰ مقام سے اتار کر مخلوق کے برابر لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ اللہ کے ادب کا مطلب ہے۔ "اللہ اکبر" اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے ادب کا مطلب ہے کہ اس کے سامنے عاجزی اور خشوع وخضوع اختیار کیا جائے۔

سورۃ المومنون آیت نمبر 1-2 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ(1) الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ(2)

ترجمہ: "کام نکال لے گئے اہل ایمان۔ وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔"

یعنی وہ مومن کامیاب ہونے والے ہیں جن کی نماز کے اندر خشوع وخضوع ہوگا۔ یہ مومن اپنے رب کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

اللہ کے ادب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی تسبیح بیان کی جائے۔ اس کا کثرت سے ذکر کیا جائے۔ اس کی عظمت کا تصور کیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسی کو اپنی زندگی کا محور بنا لیں۔ اسی کے نام

سے جئیں اور اسی کے نام سے مریں جیسا کہ سورۃ الانعام آیت 162 میں ارشادِ الٰہی ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

"آپ ﷺ کہیے میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔"

سورۃ آلِ عمران آیت نمبر 79 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ "

"اللہ والے بن جاؤ"

ایسے اللہ والے بن جاؤ کہ بس اللہ تمہارے دل پر چھا جائے۔ اٹھتے بیٹھتے وہی یاد آئے۔ اس سے محبت ہو جائے۔

ہمیں اللہ کے نام کا بھی ادب کرنا چاہیے۔ کسی کاغذ پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکیں۔ زمین پر کوئی کاغذ پڑا ہوا نظر آئے جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے اٹھا کر کہیں اونچی جگہ پر رکھ دیں۔ اللہ کے نام پر جھوٹی قسمیں نہ کھائیں۔ لغو اور لہو ولعب کے کاموں پر اللہ کا نام مت لیں۔ یعنی ایسے کام بسم اللہ پڑھ کر شروع نہ کریں۔ کبھی اللہ کی قسم کھا کر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں یہ نیک کام نہیں کروں گا۔ مثلاً قسم کھا کر یہ کہنا کہ میں فلاں شخص کو کبھی سلام تک نہیں کروں گا یا فلاں شخص سے میں کبھی کلام نہیں کروں گا۔ نعوذ باللہ۔

سورۃ البقرہ آیت 224 میں فرمانِ ربانی ہے:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

ترجمہ: "اور اللہ کے نام کو تختۂ مشق نہ بنا لو اپنی قسموں کے لیے کہ بھلائی نہ کرو گے، پرہیزگاری نہ کرو گے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

قرآن مجید کا ادب:

قرآن کریم اور وہ مجلس، جہاں درسِ قرآن ہو رہا ہو یا قرآن کی تلاوت کی جا رہی ہو، دونوں کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے۔ سورۃ الاعراف آیت 204 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

ترجمہ: "اور جب قرآن پڑھا جارہا ہو تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

البتہ اگر آپ بازار جارہے ہیں اور کسی نے تلاوتِ قرآن کی اونچی آواز سے کیسٹ لگائی ہوئی ہے تو اب ادب سے سننا صرف اس کے لیے واجب ہے۔ باقی لوگ اس کے سننے کے مکلف نہیں۔ قرآن مجید کو بے دلی سے نہیں پڑھنا یا سننا چاہیے۔ اس وقت دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھنا چاہیے۔ جہاں قرآن مجید کا درس ہو رہا ہو، وہاں متوجہ ہو کر سننا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک طرف تو درسِ قرآن ہو رہا ہو اور دوسری طرف ہم موبائل پر پیغامات بھیج رہے ہوں یا کسی سے فون پر بات کرنے لگ جائیں یا کسی ساتھی سے گفتگو کرنے لگیں۔ یہ تمام باتیں قرآن مجید کی بے ادبی کے زمرہ میں آتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ادب:

ذاتِ باری تعالیٰ کے بعد سب سے اشرف وارفع رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

سورۃ الحجرات آیت 1-2 میں فرمانِ الٰہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ②

ترجمہ: "اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اُس کے رسول سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے اہلِ ایمان! اپنی آوازیں کبھی بلند نہ کرنا نبی (ﷺ) کی آواز پر اور نہ انہیں اس طرح آواز دے کر پکارنا جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو۔ مبادا تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔"

جب نبی اکرم ﷺ کا نام آئے تو درود پڑھنا چاہیے۔ کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو اور کسی نے کہا کہ اس معاملے میں حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے تو بس بات وہیں ختم ہو جانی چاہیے اور حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق فیصلہ ہو جانا چاہیے۔

آپ ﷺ کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات، آپ ﷺ کی اولاد، آپ ﷺ کے رشتہ دار جو آپ ﷺ پر ایمان لائے، ان سب کا بھی لازماً ادب کیا جائے۔ ان کی بھی عزت کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط سالی ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسط سے دعا کرائی۔ ہمیں چاہیے کہ وقت نکال کر آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ کریں۔ جتنا زیادہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کا اپنی امت پر رحمت و شفقت کا علم ہوگا، اور یہ معلوم ہوگا کہ وہ اپنی امت کی نجات کے لیے کتنے فکر مند تھے، اتنا ہی زیادہ ہم ان سے محبت کر سکیں گے اور ان کا دل سے ادب کریں گے۔

عمر میں بڑوں کا ادب:

عمر میں بڑے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خاندان کے بزرگ، جیسے والدین، بڑے بہن بھائی، دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، تایا، پھوپھی، خالہ وغیرہ۔ ان سب کا ادب کرنا بہت ضروری ہے۔ ان کے سامنے زبان درازی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اگر بلاوجہ بھی ڈانٹ دیں تو خاموش رہنا چاہیے۔ آگے سے ان کو جواب نہ دیں۔ جوں ہی وہ ملیں، انہیں خوش دلی سے مسکرا کر سلام کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے وہ اپنی بے عزتی یا بے ادبی محسوس کریں۔

دوسرے پڑوسی یا محلہ دار۔ ان کا بھی ادب کرنا چاہیے۔ انہیں چچا یا خالہ کہہ کر پکاریں۔ ان کی ڈانٹ کو بھی محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اور ان کے سامنے بھی خاموش رہنا چاہیے۔

تیسرے وہ عمر رسیدہ لوگ جو ہمارے گھروں میں ملازم ہیں یا بے چارہ غریب ریڑھی بان، چھابڑی لگانے والا، ڈرائیور یا جھاڑو دینے والا ہے۔ ان کا بھی ادب کرنا ضروری ہے۔ اور ان سے بھی تمیز اور شائستگی سے بات کرنی چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا

ترجمہ: "وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔"

ہمیں چاہیے کہ ہم خاص طور پر اپنے بچوں کو سکھائیں کہ وہ نوکروں اور ملازموں کا ادب کریں۔

انہیں "آپ" کہہ کر مخاطب کریں۔ نام لینے کے بجائے چچا یا خالہ کہہ کر پکاریں۔ ان سے تحکمانہ لہجے میں بات نہ کریں۔ بچوں کو چاہئے کہ وہ نوکروں کو خود سلام کریں۔ اس لئے کہ چھوٹے ہی بڑوں کو سلام کرتے ہیں۔ ملازمین کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے، وہ بھی عزت چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں غریب کی آہ عرشِ الٰہی کو بھی ہلا دیتی ہے۔ علاوہ ازیں علماء کرام اور دینی شخصیات کا بھی ادب کرنا چاہئے۔ خواہ عمر میں چھوٹے ہی کیوں نہ ہو۔ گو کہ وہ عمر میں چھوٹے ہیں مگر علم میں بڑے ہیں۔

رتبے اور عہدے میں بڑوں کا ادب:

جو عہدہ میں بڑا ہو، اس کی بھی عزت کرنی چاہئے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ مثلاً ملک کا سربراہ، ادارہ کا سربراہ یا مسجد کا امام وغیرہ۔ البتہ ایسے لوگوں کے غلط کام پر تنقید کی جاسکتی ہے مگر ادب کے دائرہ میں رہ کر۔ اس طرح کوئی کاروبار کا مالک ہے تو اس کے ملازمین کو بھی اس کی عزت کرنی چاہئے۔ ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو بڑے ہیں خواہ عمر میں بڑے ہوں یا علم میں۔ عہدے میں بڑے ہوں یا رتبے میں، ان کا تو ہرگز مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ آج کل اخبار کا یہ حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی سیاستدان کا کارٹون بنا کر اس کے نیچے کوئی تبصرہ کر دیتے ہیں یا ٹی وی چینلز پر ان کے مزاحیہ کردار بنا کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر کسی جانور کے سر پر کسی سیاستدان کا سر لگا کر نیچے تبصرہ آ جاتا ہے۔ اب ہمارے ہاں سوشل میڈیا پر رواج چل پڑا ہے کہ جو بھی عہدے میں بڑے ہوں ان کا مزاحیہ کردار (Caricature) بنائے جاتے ہیں، ان کی کردار کشی کے لیے لطیفے گھڑے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ننگی ننگی گالیاں تک دی جاتی ہیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بے ادبی کرنا دنیا کا رواج بن گیا ہے۔ ہر ایک کی بے ادبی کی جاتی ہے، جملے کسے جاتے ہیں۔ جعلی سکینڈلز بنا کر انہیں اچھالا جاتا ہے۔ خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ ان سکینڈلز کی پرنٹ اور سوشل میڈیا پر تشہیر کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان پر کتابیں بھی لکھ دی جاتی ہیں۔ اصل میں تو یہ مغربی تہذیب ہے اور ہم اس کی نقالی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے پیغمبروں کو بھی نہیں بخشا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی معزز اور محترم ہستیوں پر ماضی میں یہودیوں نے جھوٹے الزام لگائے اور دورِ حاضر میں مزاحیہ فلمیں بنائی گئیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

یہ نہ صرف بے ادبی کی بات ہے بلکہ یہ تو اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ البتہ شائستگی کے

دائرے میں رہ کر اختلاف کیا جاسکتا ہے اور تعمیری تنقید بھی جاسکتی ہے۔
علم ادب کے ساتھ آتا ہے۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادب علم کے بغیر نہیں آتا۔ علم اور ادب دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

بڑوں کا ادب کیسے کیا جائے:

ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب بڑے بات کریں تو بیچ میں بات نہ کاٹی جائے بلکہ بات مکمل ہو جانے کے بعد اظہارِ خیال کیا جائے۔ اکثر معمر افراد ٹھہر ٹھہر کر اور دُہرا دُہرا کر بات کرتے ہیں۔ ان کی بات صبر کے ساتھ سنی جائے۔ بات مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے۔

مکہ میں ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ولید بن مغیرہ آیا اور اس نے بات شروع کی۔ "بھتیجے! یہ تم نے کیا کیا؟ مکہ کے گھر گھر میں فساد برپا کر دیا! تم نے ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا وغیرہ وغیرہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے عمر میں چھوٹے تھے مگر رسول ہونے کے ناطے رتبہ میں بڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیارے رسول تھے اور وہ اللہ کو دشمن تھا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات نہیں کاٹی بلکہ صبر اور خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابو ولید آپ کی بات مکمل ہوگئی؟ اس نے کہا "جی ہوگئی" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کا جواب دیا۔
اسی طرح بچوں کو سکھانا چاہئے کہ وہ بڑوں کی کسی غلطی پر مت ہنسیں۔ انہیں دور سے مخاطب نہ کریں بلکہ قریب جا کر ان سے بات کریں اور شائستگی کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کریں۔ شریعت کے دائرے کے اندر رہ کر ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ ان کی بات مان لی جائے۔ ان کا کہا مانا جائے۔

علماء اور اساتذہ کا ادب:

ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے میں شرکت فرمائی۔ نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد ان کی سواری کے لیے ایک خچر لایا گیا تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ یہ دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے میرے آقا کے ابنِ عم! میری سواری کا رکاب تھام کر آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ اب یہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آنحضور کے چچازاد بھائی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا بڑا مقام ہے۔ مگر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اطمینان سے بیٹھے۔ علماء دین کی اس طرح عزت کرنی چاہئے۔" ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید مدرسہ میں آیا تو دیکھا استاد

صاحب وضو کر رہے ہیں۔ اور شہزادہ لوٹے سے پانی ڈال رہا ہے۔ اور وہ اپنے ہاتھ سے پاؤں مل رہے ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید اپنے بیٹے پر ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ تو ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے استاد کا پاؤں دھوتا۔

یہ ہے اسلام کا معیارِ ادب اور ہماری اسلامی تہذیب۔

ادب اور حکم میں تصادم:

حکم کی بجا آوری اور ادب دونوں بہت ضروری ہے مگر بعض اوقات دونوں پر بیک وقت عمل ممکن نہیں ہوتا۔ اس صورت میں قانون یہ ہے کہ "اَلْاَمْرُ فَوْقُ الْاَدَبِ" یعنی حکم کو ادب پر فوقیت حاصل ہے۔

مثلاً کچھ لوگ کسی بزرگ کا ہاتھ چومنا چاہتے ہیں مگر بزرگ کو پسند نہیں کہ کوئی میرا ہاتھ چومے۔ لہٰذا انہوں نے منع کر دیا تو اب لوگوں کو ان کا ہاتھ چومنے پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ہمارے اسلاف میں تو یہاں تک ہوا ہے کہ کچھ علماء سفر پر جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک سینئر استاد کو سفر کا امیر بنا دیا۔ راستے میں امیرِ سفر نے ساتھیوں سے کہا کہ سامان میرے سر پر رکھ دو۔ ان کے ساتھی علماء اس وقت کو سنے لگے جب انہوں نے ان استاد صاحب کو اپنا امیرِ سفر بنایا تھا۔

ایک مرتبہ ایک دیہاتی مولانا اشرف علی تھانوی کے پاس بیعت کرنے آ گیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا معمول تھا کہ عام طور پر بہت دیکھ بھال کر بیعت لیا کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے علماء ان سے بیعت کے لیے آتے تھے اور وہ انکار کر دیتے تھے۔ مگر مولانا نے اس دیہاتی سے فوراً بیعت لے لی۔ اس کو بیعت کے تقاضے سمجھائے، کچھ ہدایات دیں اور اسے واپس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ دیہاتی ایک گٹھڑی میں مولانا کے لیے کچھ ہدیہ لے کر ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ اشرف! اسے کہاں رکھوں؟ مولانا اس وقت کچھ لکھنے میں منہمک تھے اس لیے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ سہ بارہ کہا مگر مولانا بدستور مصروف رہے۔ آخر جھنجلا کر بولے "رکھ دے میرے سر پر" اس دیہاتی نے فوراً وہ گٹھڑی ان کے سر پر رکھ دی۔ مولانا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حاضرین سے کہا "دیکھو اسی وجہ سے میں نے اس سے فوراً بیعت لے لی تھی"

لہٰذا جو بھی حکم دیا جائے اسے فوراً مان لینا چاہئے خواہ اس سے ادب میں کوئی کمی آ رہی ہو۔ عین ممکن ہے کہ کوئی شاگرد یا ماتحت ادب اور تعظیم کی وجہ سے کوئی کام کر رہے ہیں جب کہ استاد یا امیر اس کام کی وجہ سے بے اطمینانی محسوس کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں استاد یا امیر جو بھی حکم دے۔ اسے فوراً مان لینا چاہئے۔

بقول شاعر

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں پھر وفا کچھ بھی نہیں

قوانین کا احترام:

اسلام نے قانون کا ادب کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ جب قانون کا ادب اور احترام ہوگا تو قانون کی بھی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ شریعت بھی اللہ کا دیا ہوا قانون ہے۔ اس کی بھی حدود ہیں۔ اللہ کا ادب ہوگا تو اس کی شریعت کا بھی ادب ضرور ہوگا۔

ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

"مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے جو کہ بندھا ہوا ہے۔ جتنی رسی اجازت دیتی ہے، وہ گھوڑا چر چگ لیتا ہے۔" (صحیح بخاری)

مومن شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتا ہے، قانون توڑ کر پھلانگتا نہیں ہے۔

سورۃ البقرہ آیت نمبر 229 میں فرمان الٰہی ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

ترجمہ: "یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں تو انہیں پامال مت کرو"

جن لوگوں کے دلوں میں تکبر ہوتا ہے وہ قوانین کا احترام نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ قانون دوسروں کے لیے ہے میرے لیے نہیں۔ یا وہ کہتا ہے کہ میرے لیے فلاں فلاں قانون میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہ لوگ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ جب کہ قانون بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت حاصل ہوتی ہے۔ اجتماعی کام آسان ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ میں سب کے ساتھ برابری کا سلوک ہوتا ہے۔ قانون کی پابندی سے بہت سی مثبت خوبیاں ابھرتی ہیں۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کا پابند بناتا ہے تو اس میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ معاملات کو چلانے کے لیے قوانین لازمی ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ادارہ کے بھی کچھ نہ کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ اگر قانون نہ ہو یا قانون پر عمل درآمد نہ ہو رہا ہو تو ماحول میں امن وسکون کے بجائے تنازعہ اور ٹکراؤ کی کیفیت رہتی ہے۔

قانون پر عمل کرنے اور اس کا احترام کرنے سے نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستگی کے ذریعہ نظم وضبط کی عادت ڈالی گئی ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ کا وصال ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صفیں بنا بنا کر حجرہ میں جاتے۔ نماز جنازہ ادا کرتے اور باہر نکل کر آ جاتے تھے۔ تمام لوگ منظم اور پُرسکون رہے۔ نہ کوئی ہڑبونگ مچی، نہ کوئی دھکم پیل ہوئی اور نہ ہی لوگ پیروں تلے روندے گئے۔

نبی اکرم ﷺ لوگوں سے جو بیعت لیا کرتے تھے اس کے الفاظ نظم وضبط کی بہترین مثال ہیں:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (متفق علیہ)

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو یا آسانی، خواہ ہماری طبیعت کو اچھا لگے یا برا، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے، اور جس کو بھی ہم پر امیر بنایا جائے گا ہم اس سے نہیں جھگڑیں گے اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں حق کہنے سے ہم ہرگز نہیں ڈریں گے، نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں لائیں گے۔"

یہاں غور کریں کہ ہر نکتہ پر کتنا زور ہے۔ چاہے دل چاہے یا نہ چاہے۔ چاہے خوش اور راضی ہوں چاہے ناخوش اور ناراضی ہو۔ مشکل ہو یا آسانی ہم ہر حال میں اطاعت کریں گے۔

جب انسان اس طرح اپنے آپ کو قواعد وضوابط کی اطاعت اور پیروی کا عادی بنالیتا ہے تو مشکلات اور دقت کے باوجود وقت پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان فتوحات جن کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا تھا اور اس کے نتیجہ میں دین غالب ہو گیا تھا، اسی تنظیم اور اطاعت کی بدولت حاصل ہوئیں۔

اسلام نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا مزاج اعتراض والا ہو۔ ہمیں قانون کی اصلاح کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینی چاہئے۔ قانون کی اصلاح کرنا اصحابِ امر کا کام ہے۔ قانون پر تنقید کرنا بھی بے ادبی کا ایک مظہر ہے۔

سورۃ النور آیت نمبر 62 میں ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ

يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللهَ اِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

ترجمہ: "مؤمن تو صرف وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور جب وہ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں رسولؐ کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہاں سے جاتے نہیں جب تک کہ انؐ سے اجازت نہ لے لیں۔ یقیناً جو لوگ آپؐ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر۔ پھر جب وہ آپؐ سے اجازت مانگیں اپنے کسی عذر کی وجہ سے تو آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیجیے اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کیجیے۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔"

جب انسان اطاعت کو اپنی عادت بنالیتا ہے تو یہ چیز انسان کو کڑے وقت اور آزمائش کے موقع پر بھی سنبھال لیتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا مظاہرہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالکل خوش نہیں تھے۔ لیکن چونکہ اطاعت اور نظم وضبط کے خوگر ہو چکے تھے، لہٰذا اس کٹھن وقت میں بھی اطاعت کر گزرے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح آیت نمبر 26 میں فرمایا ہے۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا وَ كَانَ اللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا

ترجمہ: "جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت بٹھالی، جاہلیت کی حمیت تو اللہ نے سکینت نازل کر دی اپنے رسول ﷺ پر اور اہل ایمان پر اور اُس نے لازم کر دیا ان پر تقویٰ کی بات کو اور وہ اس کے زیادہ حق دار بھی ہیں اور اس کے اہل بھی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

اسی اطاعت کے جذبہ کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تقویٰ اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ درحقیقت تقویٰ بھی قانون کی اطاعت کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔

ادب اور احترام:

اب تک ہم نے ادب کے بارے میں بات کی ہے۔ عام طور پر ادب اور احترام کو مترادف سمجھ لیا

جاتا ہے۔لیکن ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق ہے۔"احترام" کا لفظ حرمت سے بنا ہے۔جس کا مطلب ہے کہ کسی چیز کی عظمت کی وجہ سے اس کی تعظیم کرنا۔اگر کسی کے لیے دل کے اندر عزت اور احترام ہے تو خود بخود تعظیم ہوگی۔اصل ادب بھی یہی ہے کہ دل میں احترام ہو اور جسم کی حرکات و سکنات سے بھی اس کا اظہار ہو رہا ہو، نہ کہ دکھاوا اور بناوٹی عزت و احترام لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان دل سے ہر ایک کا احترام نہیں کر سکتا۔جن لوگوں کا ادب کرنے کا تقاضا ہوتا ہے، بعض اوقات دل میں ان کا احترام نہیں ہوتا۔ایسے وقت میں بھی انسان کو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے۔دل میں اگر احترام نہیں ہے تو بھی کم از کم رویہ سے اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر مہمانوں کا ادب اور حق یہ ہے کہ خوش دلی سے ان کا استقبال کیا جائے۔انہیں ادب کے ساتھ بٹھایا جائے۔ان کی خاطر تواضع کی جائے۔لیکن اگر کچھ ایسے لوگ آجائیں جن کو ہم پسند نہیں کرتے۔ان کی کچھ بری عادتوں کی وجہ سے ہمارے دل میں ان کا احترام نہیں ہے۔تب بھی ظاہراً ان کا ادب کرنا چاہیے۔ان کا مسکرا کر استقبال کرنا چاہیے۔ جب انسان اس طرح سے ہر ایک کا "ادب" اور "احترام" کرنا سیکھ لیتا ہے تو زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لڑکیوں کو سسرال میں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کی عادات اچھی نہیں۔ایسے وقت میں لڑکیوں کو والدین کی دی ہوئی تربیت کام آتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا مناسب رویہ رکھ کر بہت سی تلخیوں سے بچ سکتی ہیں۔

آج کل ادب اور احترام کا معیار بدل گیا ہے۔بے ادبی کو اعتماد (Self Confidence) کا نام دے دیا گیا ہے۔تمام معاملات تلپٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچے بڑوں کے سامنے بدتمیزی کرتے ہیں۔دُو بدُو جواب دے دیتے ہیں تو بچوں کو حاضر جواب کہہ کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور والدین خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ بہت با اعتماد ہے۔ادب کرنا بے چارگی، بزدلی یا کمزوری کی علامت نہیں۔ادب تو وہی لوگ کرتے ہیں جو اندر سے با اعتماد ہوتے ہیں۔ورنہ زبان تو سب کے پاس ہے اور زبان چلانا بھی کوئی بہت بڑی بات نہیں۔

اہل خانہ کی تربیت

گھر انسانی معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے۔بہت سے گھر مل کر ایک محلہ بناتے ہیں۔پھر بہت سے محلے مل کر گاؤں اور قصبہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔اسی طرح شہر، ملک اور خطے وجود میں آتے ہیں۔ بہت سے گھر مل کر ایک معاشرہ کو جنم دیتے ہیں۔اگر ہر ہر گھر درست ہو جائے تو معاشرہ درست ہو سکتا ہے۔

پھر دنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ سکون کی جگہ گھر ہی ہوتا ہے۔گھر میں ایک ساتھ رہنے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے لیے قُرب اور محبت رکھتے ہیں۔

اسی محبت اور قُرب کا نتیجہ ہے کہ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کا مستقبل سنور جائے۔انہیں اپنی آئندہ زندگی میں کوئی تکلیف نہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام والدین ہی اپنی اپنی سمجھ اور اپنی ترجیحات کے مطابق اپنے گھر کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔کچھ کے نزدیک سماجی رویے بہت اہم ہوتے ہیں۔جن لوگوں کے نزدیک مال و دولت کی اہمیت ہوتی ہے، وہ اپنی اولاد کو مال کمانے کے گُر سکھاتے ہیں۔مقتدر طبقات کے لوگ اپنی اولاد کو حکمرانی کے طور طریق اور سیاست سکھاتے ہیں۔تاہم عام لوگوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد تعلیم حاصل کرے، پڑھ لکھ کر بہت اچھی نوکری کرے یا اعلیٰ کاروبار کرے اور مادی طور پر سبھی والدین اپنی اولاد کی تمام ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو اچھا کھلائیں، اچھا پہنائیں اور اچھی جگہ ان کی شادی کریں۔

لیکن سربراہِ خاندان کی اس سے بڑھ کر بھی ایک بہت اہم ذمہ داری ہے جس کی طرف عموماً توجہ نہیں دی جاتی اور وہ ہے اپنے اہل و عیال کی آخرت کی کامیابی اور آخرت کی فوز و فلاح کی فکر کرنا تاکہ وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں اور جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جائیں۔

سورۃ تحریم آیت نمبر 6 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ

ترجمہ: "اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ اس پر بڑے تند خو، بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ فرشتے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔"

اس آیت کی تشریح میں بانیٔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اس آیت میں اہلِ ایمان کو ان کے اہل وعیال کے بارے میں خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالہ سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریات زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے، بلکہ ایک مومن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالہ سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب واذہان میں دین کی سمجھ بوجھ، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہوجائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی اس جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ جہنم پر مامور فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے اور نہ ہی ان کے نالہ وشیون سے متاثر ہوں گے۔

تو کیا ہم ناز ونعم میں پلے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویہ سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل وعیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟

اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو ہم جو تعلیم دلوا رہے ہیں، کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیئے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔ (بیان القرآن جلد ہفتم صفحہ 289)

آیئے احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کی کیا

اہمیت ہے؟ اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہلواؤ اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کی تلقین کرو (شعب الایمان للبیہقی)

انسانی ذہن کی صلاحیتوں کے بارے میں جدید تجربات اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ پیدائش ہی کے وقت سے بچنے کے ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جو آوازیں کان سے سنے اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھے، اس سے اثر لے یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنے کی تلقین فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے بچے جب سات سال کے ہوجائیں تو ان کو نماز کی تلقین کرو۔ اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں تو نماز میں کوتاہی پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کردو"

اصل میں بچے سات سال کی عمر میں سمجھدار اور باشعور ہوجاتے ہیں۔ اس عمر میں ان کو خدا پرستی کے راستے پر ڈالنا چاہیئے اور اس کے لیے ان سے نماز کی پابندی کرانی چاہیئے۔ دس سال کی عمر میں ان کا شعور کافی ترقی کرجاتا ہے اور ان کے بلوغ کا زمانہ بھی قریب آجاتا ہے۔ اس وقت نماز کے بارے میں ان پر سختی کرنی چاہیئے اور اگر وہ کوتاہی کریں تو مناسب طور پر ان کی سرزنش بھی کرنی چاہیئے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی دعوت وتبلیغ کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آذر کو دین کی دعوت دی۔ جس کا تذکرہ سورۃ مریم آیات 42 تا 45 میں موجود ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ

وَاَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾

ترجمہ: "یاد کیجیے جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا: ابا جان! آپ کیوں بندگی کرتے ہیں ایسی چیزوں کی جو نہ سن سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں۔ ابا جان! یقینا میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا پس آپ میری پیروی کیجیے' میں آپ کو دکھاؤں گا سیدھا راستہ۔ ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے' شیطان یقینا رحمٰن کا نافرمان تھا۔ ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ کو آ پکڑے اور پھر آپ شیطان ہی کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔"

"یٰٓاَبَتِ" کی تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام انتہائی محبت اور دلسوزی کے ساتھ باپ کو سمجھا رہے ہیں کہ آپ شیطان کی بندگی مت کیجیے اور میری پیروی کیجیے۔ میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ پھر آخرت کے برے انجام سے بھی خبردار کرتے ہیں۔ پھر اپنے والد اور اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے نماز کا عادی بنانے با الفاظ دیگر سیدھے راستہ پر چلانے کی دعا کرتے ہیں۔ اور اپنے والدین کے لیے استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام باتیں ہماری رہنمائی کے لیے درج کی ہیں کہ اپنے اہل وعیال، اپنے والدین سے محبت کا اولین تقاضا ہے کہ انہیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کی جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت میں بھی ہمیں یہی انداز نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں آپ ﷺ کی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، غلام حضرت زید بن حارثہ، چچازاد بھائی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔

اہلِ خانہ کی تربیت بہت محبت اور دلسوزی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ تاہم کبھی کبھی تادیب کے لیے سختی بھی ضروری ہوتی ہے۔ مگر اس سختی کا استعمال بھی حکمت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حد سے زیادہ مار پیٹ کے نتائج الٹ نکلتے ہیں۔ بچے تعلیم ہی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے"
کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ سے"

اہل وعیال کی تربیت کے ضمن میں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ ان کی محبت حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ سورۃ التغابن آیت 14 میں ارشاد ربانی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾

ترجمہ: "اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' سو ان سے بچ کر رہو۔ اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔"

آج ہمارے معاشرے کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی، بچوں کی دشمنی والی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ لیکن اگر کوئی بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہو تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں، بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات، ان کی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم کے اخراجات اگر حلال کی کمائی سے پوری نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا۔ یا تو حرام میں منہ مارے گا یا ڈالر کمانے ملک سے باہر جائے گا۔ دونوں صورتوں میں بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت نہ ہو سکے گی اور ان کی آخرت برباد ہو کر رہ جائے گی۔

یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے۔ اس لیے اگلے جملے میں اہل وعیال کے ضمن میں نرمی اختیار کرنے کی تلقین کی جارہی ہے کہ اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل وعیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نمٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر صبح و شام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "تم میں سے ہر آدمی نگہبان ہے اور ہر آدمی اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ (صحیح) (متفق علیہ)

اس حدیث مبارکہ کے مطابق ہم اپنے اہل خانہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہیں کہ ان کے ضمن میں ہم نے اپنی ذمہ داری نبھائی یا نہیں۔ اسی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کے لیے یہ لازمی کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال اور اپنے زیر کفالت افراد کی تربیت کے لیے ایک "گھریلو اُسرہ" کا قیام عمل میں لائیں۔ مبتدی رفقاء اور

احباب کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے اہلِ خانہ کی تربیت کے لیے "گھریلو اُسرہ" ضرور قائم کریں۔ سربراہِ خاندان خود اس اسرہ کا منتظم ہو اور خاتونِ خانہ اس کام میں شوہر کی معاونت کریں۔ بہتر ہوگا کہ یہ مجلس ہفتہ وار منعقد کی جائے اور اس کا دورانیہ کم از کم ایک گھنٹہ ہو۔

اسرہ کا نصاب درج ذیل کیا گیا ہے۔ جس کی ذمہ داری گھرانہ کے مختلف افراد کو مل جل کر نبھانی چاہیے۔

1) تلاوت اور ترجمہ قرآن
2) آدابِ زندگی (محمد یوسف اصلاحی) سے بنیادی اخلاقیات کا مطالعہ
3) سیرۃ النبی ﷺ (ترجمہ الرحیق المختوم) کا سلسلہ وار مطالعہ
4) سیرتِ صحابہ/صحابیات کا مطالعہ
5) مشہور دینی شخصیات کے دل پر اثر کرنے والے واقعات

عمر کے مختلف ادوار میں بھی تعلیم و تربیت کا مختلف انداز بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ 10 سال کی عمر تک پیار محبت سے، اس کے بعد ہلکی پھلکی سختی اور پھر جوانی کے دور میں صرف دلائل اور محبت کے ساتھ بات سمجھانی چاہئے۔

دورِ حاضر میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم نہ صرف سیکولر ہے بلکہ دین سے دور کرنے والی بھی ہے۔ ایمان میں شکوک پیدا کرتی ہے۔ اس کائنات کے علم کو ہی اصل علم قرار دیتی ہے۔ طبیعات کے قوانین کو حتمی قرار دیتی ہے۔ تعلیم کا پورا زور جسم، کائنات اور حیاتِ دنیوی کی طرف ہے۔ اللہ، روح اور حیاتِ اخروی کی طرف بالکل توجہ نہیں۔ ان حالات میں تو اب ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ گھر پر ان کی دینی تعلیم کا بندوبست کریں اور مرّوجہ تعلیمی اداروں کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور مغالطوں کو دور کرنے کی فکر کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ خود بھی دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں اور اس جدوجہد میں اپنے اہل وعیال کو بھی شریک کریں۔ تاکہ غلبۂ دین کی راہ ہموار ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اہل وعیال کی تربیت کے ضمن میں ہماری مدد فرمائے۔

ہمارے والدین اور ہمارے اہل وعیال سمیت تمام مومنین کی مغفرت فرمائے۔

آمین یارب العالمین۔